کراچی

ماہنامہ

آنکھ مچولی

سبز پری کی ساتھی ہوں میں
کوہ قاف سے آئی ہوں

سرِورق کی کہانی اندر ملاحظہ کیجیے

جام جیلی مارملیڈ

اب نئے انٹرنیشنل پیک میں

قدرت نے ذائقہ دیا **احمد** نے محفوظ کیا

مُدیرِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ
مُدیرِ مسئول
تجمل حسین چشتی
مشاورت
مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد
مُدیرانِ اعزازی
طاہر مسعود
محمد سلیم مُغل
مجلسِ ادارت
شاہنواز فاروقی، سید خورشید عالم
خطاط
عارف سعید

جلد ۳
شمارہ ۵
نومبر ۱۹۸۸ء
ربیع الاوّل ۱۴۰۹ھ
قیمت ۶ روپے

زرِ سالانہ کے لیے خصوصی رعایت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

ماہنامہ
آنکھ مچولی میں
شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق
بحقِ ادارہ محفوظ ہیں، پیشگی
اجازت کے بغیر کوئی تحریر
شائع نہیں کی جاسکتی

ماہنامہ
آنکھ مچولی
میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث
پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و
واقعات فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ
مماثلت کی صورت میں
ادارہ ذمہ دار
نہ ہوگا۔

ناشر
ظفر محمود شیخ
طابع۔ زاہد علی، مطبع۔ لاریب
پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی

گرین گائیڈ اکیڈمی
ادارہ اشاعت برائے
تعلیم و تعمیرِ سیرتِ اطفال
زیرِ سرپرستی
ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن

گرین
گائیڈ اکیڈمی
برائے خط و کتابت ۱۱۲۔ ڈی، نورس روڈ
و مقامِ اشاعت سانٹ، کراچی

بےشک آنے والا وقت تمہارے لئے بہتر ہے اس وقت سے جو گزر چکا
اور بے شک تمہارا رب ایسی نعمتوں سے تم کو نوازے گا جو تم کو خوش کردیگی۔

یہ الفاظ مبارکہ جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب
فرمائے، تمام سچے مسلمانوں کیلئے طمانیت کا پہلو رکھتے ہیں۔
آیئے ہم اللہ تعالےٰ کے حضور میں سر جھکا کر ان رحمتوں کا شکر
بجالائیں جو امتِ مسلمہ پر اب سے پہلے ہوتی رہیں اور عہد کریں کہ
آئندہ اور زیادہ عنایات کا مستحق بننے کی کوشش کرینگے۔
ایک فریضہ جو ہم پر عائد ہوتا ہے، نظام اسلام کی تعمیر ہے۔
جو بفضلہٖ تعالیٰ پاکستان میں شکل پذیر ہو رہا ہے۔
نیشنل بنیک اس مبارک مہم میں حسبِ توفیق شریک رہے گا۔

نیشنل بینک آف پاکستان — قومی ترقی قومی بینک

PID 1 19/85

حسنِ ترتیب

- اداریہ — ۷
- ڈاک ڈاک کس کی ڈاک — ۸
- اس ماہ کا نام کیسے پڑا؟ — ۱۱
- عظیم الشان مملکت — ۱۳
- عکس — شاہنواز فاروقی — ۲۱
- متحد ہونا اِک عبادت ہے — نظم — ۲۷
- میں شاعر بنوں گا — مسز جاوید خالد — ۲۹
- لکھنے سے پہلے — طاہر مسعود — ۳۳
- انسان اور فطرت — ۳۷
- آخری کلاس — سیدہ خورشید عالم — ۳۹
- یوں گزاری ہیں چھٹیاں میں نے — یونس وسیم بن اشرف — ۴۲
- ڈاک بابو — اخلاق احمد — ۴۷
- ہائے ہماری ہاکی ٹیم — محمد امان خان دل — ۵۳
- ثمیرا — ہیلن کیلر — محمد سلیم مغل — ۵۵
- بکری کے دو بدھو بچے — پروفیسر عنایت علی خان — ۶۳
- اور پنکی قتل کر دی گئی — احمد حاطب صدیقی — ۶۴
- سائنس انکوائری — نیر ابدالی — ۶۹
- کھٹ مٹھے — ۷۲
- سبز پری کی ساتھی (سرورق کی کہانی) — شین فاروقی — ۷۶
- بچوں کا گیت (نظم) — فیضان عارف — ۸۳
- کرکٹ کے دلچسپ واقعات — علی حسن ساجد — ۸۴
- اس ماہ کے بڑے لوگ — ۸۷
- چھپا ہوا خزانہ — سعیدہ نازش — ۹۱
- سوال در سوال — ابو اسامہ — ۹۷
- گنی چنی معلومات — عقیل عباس جعفری — ۱۰۳
- نئی تحریریں — ۱۰۶
- آؤ ملائیں ہاتھ — ۱۱۰
- امی ابو کا صفحہ — شانی ایوب — ۱۱۸

نشانِ عظمت

نو عمر لڑکے نے تلاوت کے بعد قرآن مجید کو بند کیا عقیدت سے اُسے چوما اور نہایت احترام کے ساتھ الماری میں رکھ دیا۔

"اب مجھے ابّا جان کے پاس جانا چاہیے انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میرے امتحان میں کامیابی کے بعد وہ مجھے ایک نہایت اہم بات بتائیں گے"۔ اُس نے یہ سوچا اور ابّا جان کے کمرے کی طرف چل دیا۔

"آؤ بیٹے آؤ! بیٹھو" ابّا جان نے اُسے دیکھ کر مسرت سے کہا "تمہاری کامیابی سے مجھے بہت خوشی ہوئی تمہیں مبارک ہو"۔

"جی بابا! شکریہ۔ یہ آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے"۔ لڑکے نے کہا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد لڑکا پھر بولا۔

"ابّا جان آپ نے کہا تھا کہ ایک نہایت اہم بات بتائیں گے"۔

"ہاں بیٹے وہ اہم بات یہ ہے کہ.... اچھا پہلے یہ بتاؤ تم نے آج قرآنِ پاک کی تلاوت کی؟"

"جی ہاں، یہ تو میرا ہر روز کا معمول ہے"۔ لڑکے نے سعادت مندی سے کہا۔

"بہت خوب"۔ ابّا جان نے کہا "یاد رکھو اِس معمول میں زندگی بھر فرق نہ آئے اور وہ اہم بلکہ اہم ترین بات یہ ہے کہ جب تم قرآن پاک پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اُترا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے"۔

لڑکے نے یہ بات کانوں سے سُنی اور دِل میں اُتار لی، اسے عربی زبان سے واقفیت نہیں تھی لیکن باپ کی نصیحت سُننے کے بعد وہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہو گیا کہ اس کا اللہ اُس سے کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے قرآن کی زبان سیکھنا شروع کی، اس کے معنی اور مطالب پر غور کرنا شروع کر دیا اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ وہ بہت بڑا اسلامی مفکّر اور شاعر کہلایا۔ اس کی فکر نے مسلمانوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کے پیغام سے غلامی کی زنجیروں میں برسوں کے جکڑے ہوئے مسلمان بیدار ہو گئے اور آزادی کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ زنجیریں ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگیں اور بالآخر مسلمانوں کا علیحدہ آزاد وطن پاکستان بن گیا۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ باپ کا اطاعت گزار یہ بچہ کون تھا؟ یہ علّامہ اقبال تھے جنہیں ہم پاکستانی، حکیم الاُمّت، مفکّرِ پاکستان اور شاعرِ مشرق کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔

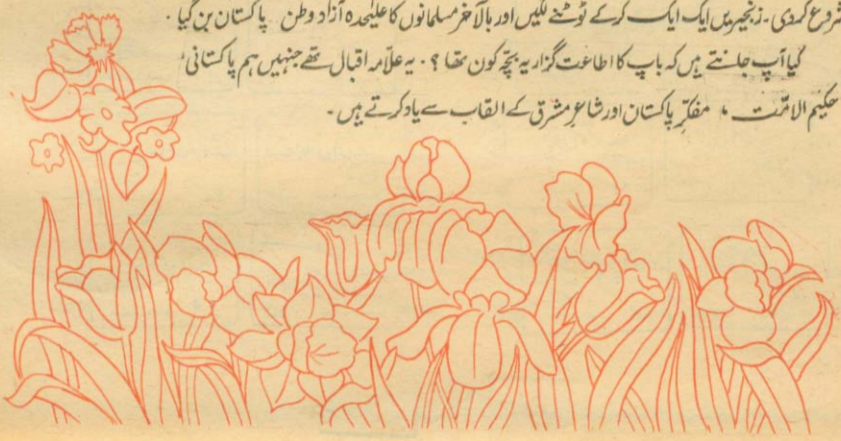

اداریہ

حیدرآباد اور کراچی کے خونی فسادات اب تک سینکڑوں بچوں کو یتیم و بے سہارا کر چکے ہیں۔ ان فسادات نے نہ جانے کتنے ہی بچوں کے سروں سے ان کے والدین کا سہارا چھین کر انہیں زندگی کی تپتی دھوپ میں دربدر ٹھوکریں کھانے کے لیے بے آسرا چھوڑ دیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بزدلانہ حملے میں وہ معصوم بچے اور بچیاں بھی جاں بحق ہوئے ہیں جنہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان پر آخر کس جرم میں گولیاں چلائی جا رہی ہیں۔ یہ بچے، جو اپنے گھروں سے کھیلنے کے لیے یا اپنے والدین کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے یا بازار سے کھلونے خریدنے کے لیے نکلے تھے، بیچوں بیچ سڑک پر زندگی سے محروم کر دیے گئے۔ جن معصوم ہاتھوں میں رنگین غبارے ہونے چاہئیں، وہ ہاتھ خون سے رنگین ہو گئے.... جن چہروں کو مسکراہٹوں اور قہقہوں سے روشن ہونا چاہیے، اُن پر موت کی زردی چھا گئی.... جنہیں آگے چل کر ملک و قوم کا سہارا ہونا چاہیے، اُنہی کو بے سہارا کر دیا گیا۔ خونریز جنگوں کے بھی کچھ مہذب اصول ہوتے ہیں کہ ان میں عورتوں اور بچوں کی جان بخش دی جاتی ہے... افسوس کہ ان فسادات نے نہ صرف میدانِ جنگ کی لڑائی کو مات کر دیا بلکہ چنگیز و ہلاکو کی یاد تازہ کر دی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ لسانی فسادات ہیں.... قوم کے ننھے مُنے ذہن سوال کرتے ہیں کہ اگر ہم سب مسلمان ہیں تو پھر رنگ و نسل کے نام پر یہ جنگ و جدال کیوں؟ کیا وہ لوگ جنہوں نے عصبیت کی آگ روشن کی ہے اور جس آگ میں اب سبھی جُھلس رہے ہیں، اُنہیں نہیں معلوم کہ اسلام عصبیت کا کتنا بدترین دشمن ہے۔ کیا اُنہیں وہ واقعہ نہیں معلوم کہ جب غزوہ بنی مصطلق کے موقعے پر کنویں پر سے پانی پینے پر ایک مہاجر کا ایک انصار سے جھگڑا ہو گیا۔ جب لڑائی بڑھی تو مہاجر نے اپنی مدد کے لیے مہاجروں کو پُکارا اور انصار نے اپنی حمایت کے لیے انصاریوں کو آواز دی۔ جب دونوں گروہ اپنے اپنے حامیوں کو بُلا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آؤ میری مدد کے لیے..... اُسی وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں میں یہ آوازیں پہنچیں تو آپؐ اپنے خیمے سے فوراً باہر نکل آئے اور فرمایا

"یہ جاہلیت کی کیسی پُکار ہے جو تم بلند کر رہے ہو... اِسے چھوڑ دو، کیونکہ یہ بڑی گھناؤنی پکار ہے!"

آج ایسی ہی گھناؤنی آوازیں ہمارے کانوں میں بھی آرہی ہیں۔ اس پکار پر ہم کان دھرنا کب چھوڑیں گے؟

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک

غلام حسین چین، حیدرآباد ۔ آپ کو شکایت ہے کہ آپ کے خطوط نظرانداز کر دیے جاتے ہیں اور ہمیں گلہ ہے کہ قارئین ہماری مشکلات کو خاطر میں نہیں لاتے ۔ لیجیے حساب برابر ہوا ۔ آپ نے جن اصحاب کے انٹرویو چھاپنے کی فرمائش کی ہے ان میں ایک صاحب کے انٹرویو نوائن کے اپنے رسالے میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ رہے ڈاکٹر پری شان خٹک صاحب تو ہم نے آپ کی یہ فرمائش نوٹ کر لی ہے ۔ اداریہ پسند کرنے کے ساتھ ساتھ آپ نے سوال اُٹھایا ہے کہ تعلیمی اداروں میں افراتفری پھیلانے والے اب تک قانون کی گرفت سے بچے ہوئے کیوں ہیں؟ اصل میں یہ سوال قانون نافذ کرنے والے اداروں سے کیا جانا چاہیے ۔ کیونکہ اگر وہ اپنے فرائض مخلصانہ طریقے سے ادا کرتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی ۔

فوزیہ جمیل ، شہر کا نام نہیں لکھا ۔ آپ نے آنکھ مچولی پہلی بار پڑھا اور اس کی گرویدہ ہو گئیں ۔ اس میں آنکھ مچولی کی خوبی سے زیادہ آپ کی خوش ذوقی کا حصہ ہے ۔ اس رسالے کو آپ اپنا رسالہ سمجھیے اور اسے بہتر بنانے کے لیے اپنی تجویزیں بھی بھیجیے ۔ ہم آپ کے ممنون ہوں گے ۔

اسمٰعیل عبدالرحمٰن ، میٹھادر، کراچی ۔ آپ نے لکھا ہے کہ "سوال در سوال" کا کوپن اس طرح شائع کیا جائے کہ اُسے آسانی سے پرچے سے علیحدہ کیا جا سکے ۔ کمال ہے بھئی ایسا کیا مسئلہ ہے ۔ آپ کوپن کو قینچی کی مدد سے بھی کاٹ کر علیحدہ کر سکتے ہیں اور آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ "آؤ ملائیں ہاتھ" میں صرف اسکول کے بچوں کی تصویریں اور تعارف شائع ہوتے ہیں ۔ آپ شوق سے اپنے دوستوں کا تعارف بھیجیے ۔

لعل زیب تبسم، چارسدہ ۔ میرے خدا، اتنا غصہ ..... صرف اتنی سی بات پر کہ آپ کا خط کیوں شائع نہیں ہوا ۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجیے اور یہ بتائیے کہ آپ کے اس خط میں بھی جواب دینے والی بات کون سی ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ بہت دُور سے خط لکھتی ہیں ۔ لیکن پرچے کے متعلق اپنی کوئی رائے، تجویز، مشورہ، کوئی تو ایسی بات لکھیے تاکہ ہم اُسے شائع کریں ۔ کیا اب آپ بھی ناراض ہو گئیں ۔

محمد عرفان بھٹی، سکھر ۔ سکھر والوں سے دشمنی ..... خدانخواستہ ہمیں کیوں ہونے لگی ۔ ہم تو دشمنوں کو بھی دوست بنانے کے قائل ہیں ۔ جبکہ آپ تو پہلے ہی ہمارے اچھے دوست ہیں ۔ لیکن صاحب دوستی میں بھی ہم انصاف کے قائل ہیں ۔ آپ کی تحریریں قابل اشاعت ہوں گی تو ضرور شائع ہوں گی ۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟

عبدالرحمٰن ساجد ، راولپنڈی ۔ آپ قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے آپ مقابلہ معلومات عامہ کرانا چاہتے ہیں اور معلومات عامہ کے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے آپ نے فیس بھی رکھی ہے ۔

جبکہ فیس کے مقابلے میں انعامات کی رقم بے حد ہے معاف کیجیے گا نہیں تو یہ اچھی بھلی تجارت محسوس ہوئی۔ لہٰذا ہم اس میں آپ سے تعاون کے لیے معذرت خواہ ہیں

محمد رفیق، گرومندر، کراچی۔ آپ نے اتنے ڈھیر سارے مضامین لکھ رکھے ہیں تو پھر اسے بھیجتے کیوں نہیں اور پھر اس کے لیے پیشگی اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ فوراً بھیجیے۔ فٹافٹ۔ اگر مضامین اچھے ہوئے تو ضرور چھپیں گے۔

حامد علی شاہد، چکوال۔ بھئی سچ سچ بتائیے..... کیا آپ ہمیں خط صرف اسی لالچ میں لکھتے ہیں کہ کہیں کونے میں آپ کا نام چھپ جائے۔ بخدا ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ رسالے اور ہماری محبت میں خط لکھتے ہیں اور اسی لیے ہم نے آپ کا نام نہ شائع کر کے آپ کی محبت کو آزمایا..... افسوس کہ آپ اس میں ناکام ہو گئے..... لیجیے آپ کا نام شائع کیا جا رہا ہے..... اب تو آپ خوش ہیں!

محمد نواز چوہدری، میرپور، آزاد کشمیر۔ آپ نے لکھا ہے کہ "کیا وجہ ہے کہ آپ آزاد کشمیر کے ساتھیوں کی نہ کہانی شائع کرتے ہیں، نہ خط اور نہ کوئی لطیفہ، کیا آپ ہمیں پاکستان میں رہنے والے دوسرے ساتھیوں کی طرح نہیں سمجھتے۔ ہمیں تو پاکستان سے اتنی محبت ہے کہ خدا کی قسم اگر پاکستان کو ہماری ضرورت پڑی تو ہم اپنے خون کا آخری قطرہ بھی اپنے محبوب پاکستان پر قربان کر دیں گے۔" میرے بھائی آپ کے جذبات قابل قدر ہیں۔ اسی لیے ہم نے آپ کے خط کا یہ حصہ نقل کر دیا۔ تاکہ دوسرے ساتھیوں کو بھی پتا چل جائے کہ کشمیری بھائیوں کے دل میں پاکستان کے لیے کیا جذبات ہیں۔

اب رہا سوال کہ آپ کی کہانیاں اور لطائف شائع کیوں نہیں ہوتے تو بھئی بات یہ ہے کہ تحریریں اگر معیاری ہوں تو ان کے نہ چھپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے اور کشمیری ہمارے بھائی..... بلکہ اگر بھائی سے بڑھ کر کوئی رشتہ ہے تو ہم اسی رشتے میں منسلک ہیں۔

محمد سمیع اللہ، دیپالپور۔ آنکھ مچولی کا قہقہہ نمبر پڑھ کر آپ پر ہمارے خوشی کے ایسا سکتہ طاری ہوا کہ تین مہینے تک آپ خط لکھنے کے قابل ہی نہ ہوئے اور اب آپ کے دل کی دھڑکن بحال ہوئی ہے تو آپ نے قلم سنبھالا ہے۔ خدا کا شکر کہ اب آپ کی صحت بحال ہے ورنہ ہم پر تو مقدمہ قائم ہو سکتا تھا۔

آپ نے حیرت ظاہر کی ہے کہ اتنا اچھا رسالہ کس طرح شائع ہوتا ہے... بھئی یہ کاغذ پر پریس میں چھپتا ہے۔ آپ نے یہ بھی پوچھا ہے کہ ہم اتنا اچھا رسالہ کیوں شائع کرتے ہیں۔ بھئی یہاں پر تو ہم بھی لاجواب ہو گئے۔

شاذیہ عزیز، کراچی۔ آپ کو اعتراض ہے کہ آنکھ مچولی میں کہانیاں بہت کم شائع ہوتی ہیں۔ شاذیہ بہن، ایسا تو نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ساتھیوں کو کہانیوں کے علاوہ، معلوماتی مضامین بھی پڑھنے چاہئیں۔ رسالے کو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مفید بھی ہونا چاہیئے۔ کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟

عبداللطیف، مندھی مسلم سوسائٹی، کراچی۔ آپ کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ بچوں کو نماز پڑھنی چاہیئے۔ اور قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ آنکھ مچولی میں ہم ایسے مضامین شائع کرتے رہتے ہیں۔ اب آپ نے توجہ دلائی ہے تو ہم مذہبی مضامین کی تعداد بڑھانے کی کوشش کریں گے۔

محمد ایوب داؤد پوتہ۔ حیدرآباد۔ آپ تو بڑے بہادر لگتے ہیں لیکن ضروری تو نہیں کہ سارے ساتھی اتنے ہی بہادر اور دلیر ہوں جتنے آپ ہیں۔ ڈراؤنی کہانیاں چونکہ عام طور پر چھوٹی ہوتی ہیں اس لیے ہم مجموعی شائع کرنے کے خلاف ہیں۔ اور پھر غور کیجیے تو ہمارے اردگرد پہلے ہی اتنے ڈراؤنے واقعات پیش آ رہے ہیں کہ مزید خوفناک کہانیاں شائع کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ کا لفافہ ہمیں نہیں ملا۔ نئی تحریر کا فیصلہ پڑھ کر کیا جائے گا۔

عباد علی سحرناز۔ لاہور۔ میرے عزیز، آنکھ مچولی، آپ جیسے ذہین دوستوں کی حوصلہ افزائی کے لیے نکالا گیا ہے۔ مطمئن رہیئے۔ اگر آپ کی کہانی اچھی ہوئی تو کیوں نہیں شائع ہو گی..... آپ نے لکھا ہے کہ کوئی نئی خوشخبری سنائیے۔ انشاءاللہ جنوری کے مہینے میں آنکھ مچولی ایک نئی خوشخبری کے ساتھ منظر عام پر آئے گا۔ آپ کو ابھی ذرا انتظار کرنا ہو گا۔

فیصل مختار، تھرپارکر۔ کہانی کیسے لکھی جاتی ہے، پچھلے مہینے اس پر تفصیلی مضمون شائع کیا جا چکا ہے۔ امید ہے اسے آپ نے پڑھا ہو گا... اگر

نہیں پڑھا تو پڑھ لیجیے.... اس کی روشنی میں اگر آپ کہانی لکھیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ شائع نہ ہو.... پھر بھی کہانی لکھنے کے لیے بہت مطالعے اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے، عجلت کرنے کے بجائے محنت کیجیے۔

عطیہ منیر، اٹک کینٹ۔ جن ساتھیوں کی کوئی تحریر شائع نہیں ہوتی، وہ سمجھتے ہیں کہ شاید انہوں نے رسالے کی زیادہ تعریف نہیں کی ہے اس لیے ایسا ہوا۔ ارے بھئی ایسی بات بالکل نہیں ہے۔ کیا آپ ہمیں خوشامدی سمجھتی ہیں؟ لاحول ولاقوۃ..... آپ کی نظم شائع نہیں ہوئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم انتظار کر رہے تھے کہ شاید آپ ہمیں اس سے اچھی نظم بھیجیں گی۔ اور آپ نے اس کا مطلب کچھ اور نکال لیا۔ بتایئے پھر غلطی کس کی ہے؟

ولی محمد، ملتان چھاؤنی۔ کرکٹ سے آپ کی والہانہ محبت سے ہمیں تشویش ہونے لگی ہے۔ کہیں آپ ہر وقت کرکٹ ہی تو نہیں کھیلتے رہتے۔ یقیناً ایسا نہیں ہوگا کیونکہ آپ تو ہمارے قلمکار دوست ہیں۔ کسی مناسب موقع پر آپ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ویسے جاوید میانداد کا انٹرویو آنکھ مچولی میں شائع کیا جا چکا ہے۔

ابن مفرح دل، مردان ڈویژن۔ پانچ صفحات پر مشتمل آپ کا طویل خط آپ کی محبت کا آئینہ دار ہے۔ اتنی ڈھیر ساری باتیں آپ نے لکھی ہیں کہ کچھ میں نہیں آرہا کہ کس کا جواب دیا جائے اور کس کا جواب نہ دیا جائے لیکن ہمیں جواب کا آپ کو انتظار ہے وہ یہ ہے کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت اچھی ہے، لیکن ابھی آپ کو اور محنت کرنی چاہیے۔ "رہنما" منگوانے کے لیے دس روپے کا منی آرڈر ارسال کیجیے۔

حامد علی شاہد، لاہور، چکوال۔ اگر آپ کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور اندر سے جواب نہ ملے۔ تو پھر آپ کو کیا کرنا چاہیے؟ ظاہر ہے انتظار لیکن آپ تو انتظار کرنے کے بجائے واپس لوٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ مناسب بات نہیں ہے اور پھر آپ کے خط کا جواب تو دیا جا چکا ہے پھر ناراضگی کیسی....؟

عامر مسعود نیاز، عارف والا۔ آنکھ مچولی کی پسندیدگی کا شکریہ۔ جن دو شماروں کی آپ کو ضرورت ہے اس کے لیے ۱۲ روپے کا منی آرڈر ارسال کر دیجیے۔ مطلوبہ رسالے آپ کو بھیج دیے جائیں گے۔

نیاز الدین، صوابی۔ آپ کی تجویز پر ہم سائنس اسپیشل نکالنے پر غور کریں گے.... تجویز اچھی ہے لیکن آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ کسی خاص موضوع پر رسالہ نکالنے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے اور پھر سائنس کا موضوع تو بہت زیادہ توجہ مانگتا ہے۔

★ ★

اولمپک میڈل جیتنے والے عظیم باکسر حسین شاہ آنکھ مچولی کی محفل میں۔

پاکستان کے لیے شہرت اور نیک نامیاں کمانے والے عظیم باکسر حسین شاہ کی زندگی کا احوال، بچپن کی یادیں۔ جدوجہد کی داستان اور باکسنگ کے سفر سے متعلق بہت سی اہم باتیں خود ان کی زبانی جاننے کے لیے دسمبر ۸۸ء کا شمارہ پڑھنا نہ بھولیے

(ادارہ)

محمد اسلم شیخوپوری

اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟

ربیع الاوّل

ربیع الاوّل اسلامی سال کا تیسرا مہینہ ہے "ربیع" کے معنیٰ ہیں 'موسمِ بہار' اور 'ربیع' کا مفہوم ہے انتظار کرنا "اقامت کرنا" "الاوّل" کے معنی ہیں 'پہلا'۔ اس مہینے کا نام ربیع الاوّل اس لیے رکھا گیا کہ یہ موسمِ بہار کا مہینہ تھا۔ اس میں پھول کھلتے تھے اور شاخوں پر شگوفے پھوٹتے تھے اور اہلِ عرب گھروں میں قیام کرتے تھے۔ یہ مہینہ صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس مہینے ہی میں ہم سب کے محسن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ آپؐ کے دنیا میں تشریف لانے سے تاریخ کا دھارا بدل گیا یہ عجیب اتفاق ہے کہ آپؐ اسی مہینے میں پیدا ہوئے اور اسی مہینے میں آپؐ نے وفات پائی۔ مشہور تو یہی ہے کہ آپؐ کی ولادت اور وفات کا دن ایک ہی ہے۔ یعنی بارہ ۱۲ ربیع الاوّل مگر بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ آپؐ پیدا تو نو ۹ ربیع الاوّل کو ہوئے مگر آپؐ نے وفات بارہ ۱۲ ربیع الاوّل کو پائی۔ بہرحال مسلمانوں کو اس مبارک مہینے میں آپؐ کی پیدائش کی خوشی بھی ہوتی ہے اور وفات کا غم بھی ہوتا ہے۔ یکم ربیع الاوّل کو حضرت امام حسن شہید ہوئے۔ ان کو بعض بدبختوں نے دھوکے سے زہر دے دیا تھا۔ وہ حضورؐ کے نواسے اور حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے بیٹے اور حضرت حسینؓ کے بھائی تھے۔ عظیم محدث حضرت امام مالکؒ جنھوں نے اپنی ساری زندگی مدینہ منورہ میں گزار دی وہ گیارہ ۱۱ ربیع الاوّل کو فوت ہوئے اور سترہ ۱۷ ربیع الاوّل کو حضرت امام جعفر صادق پیدا ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کی خدمت اور دینِ اسلام کی حفاظت و اشاعت کے سلسلہ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

یہ دونوں تصاویر بظاہر یکساں ہیں مگر ان میں کچھ فرق بھی ہیں جو پہلی نظر میں معلوم نہیں ہوتے .. اگر آپ چار منٹ کے اندر اندر یہ فرق ڈھونڈ نکالیں تو ہم آپ کو "ذہین" مان لیں گے۔

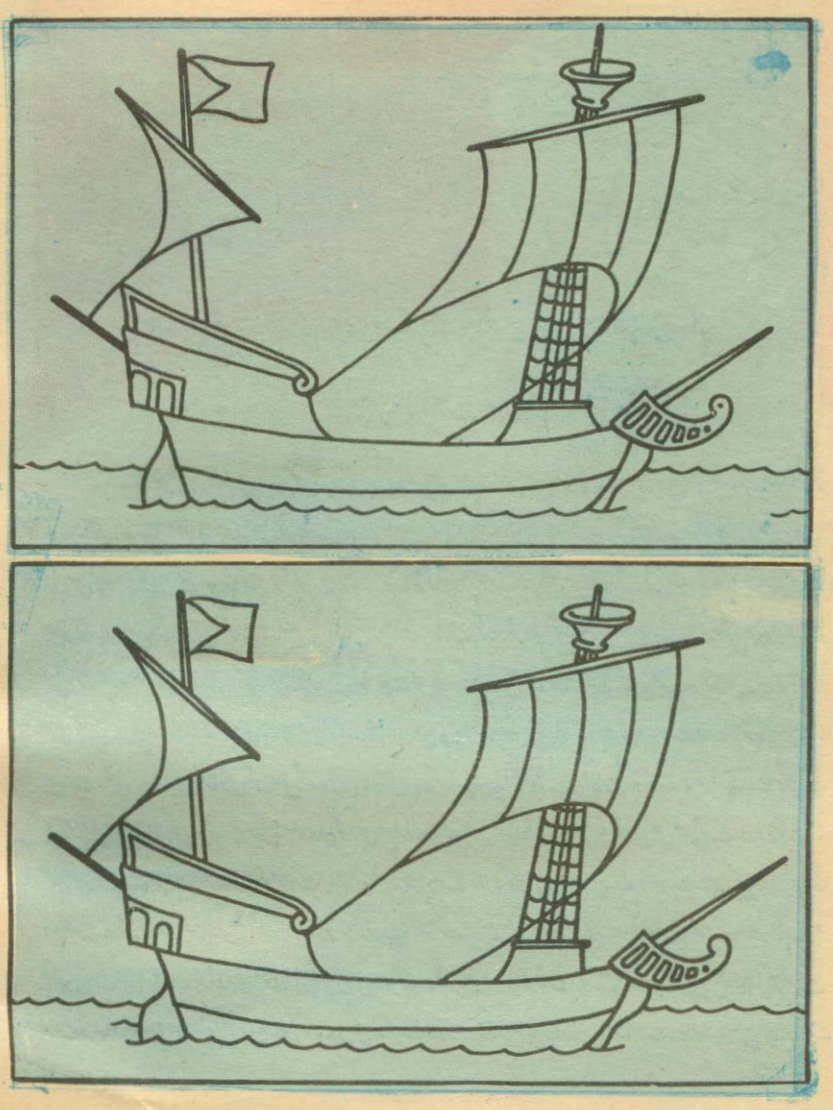

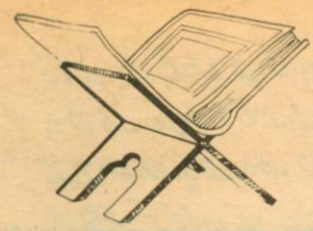

عرب کے جنوبی حصے یمن میں ایک بہت بڑی مملکت آباد تھی اُس کا دارالخلافہ مآرب تھا۔ لیکن اس شہر کو سبا بھی کہتے تھے۔ یہاں ایک عورت حکومت کرتی

حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی قرآنی کہانی جو تمام کہانیوں سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

عظیم الشّان مملکت

تھی۔ یہ عورت انتہائی حسین وجمیل تھی۔ اس کی حکومت روز بروز پھیلتی جارہی تھی۔ افریقہ اور حبشہ تک اس کی حکومت پھیل گئی تھی اس نے یمن میں دُور دُور تک بڑے مضبوط قلعے تعمیر کئے ہوئے تھے۔ اس ملکہ کا بہت بڑا شاہی محل تھا۔ ہزاروں افراد پر مشتمل وزیر اور مُشیر ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اس کا محل ایک عجوبہ تھا۔ اس محل میں اس نے ایک ایسا ہال بنا رکھا تھا جس کے ہر دروازے سے صبح نکلتے ہوئے سورج کو دیکھا جا سکتا تھا اور شام کو اس کے مدِّمقابل کے دروازے سے سُورج غروب ہوتا نظر آتا تھا۔ اس ہال میں اس نے ایک تخت بنوا رکھا تھا تخت اپنے وقت کا انتہائی خوبصورت اور بڑا عجوبہ تھا۔ اُسے کروڑوں روپے کے یاقوت، مرجان اور ہیروں سے تیار کیا گیا تھا۔ اس تخت کی ملکہ بہت حفاظت کرتی تھی جس ہال میں تخت رکھا ہوا تھا اس کے گرد سخت پہرہ لگا ہوا تھا۔ خود ملکہ کی خدمت میں سینکڑوں کنیزیں ہر وقت حاضر رہتی تھیں۔

ایک روز کیا ہوا کہ ملکہ اپنے خلوت کدے میں بیٹھی آرام کر رہی تھی۔ ابھی ملکہ کی پلکیں بند ہی ہوئی تھیں کہ کمرے میں کچھ آہٹ ہوئی ملکہ نے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کیا دیکھتی ہے کہ ایک ہُدہُد اپنی چونچ میں خط لئے بڑے ادب سے اُس کی مسہری کے پاس آیا اور خط ملکہ کے سامنے رکھ کر مسہری کے کونے پر جا بیٹھا۔ ملکہ حیرت سے یہ منظر دیکھتی رہی آخر اس نے کانپتے ہاتھوں سے خط اٹھایا، لفافہ کھولا اور پڑھنے لگی۔

اب ذرا خط بھیجنے والے کا قصّہ سُنیئے۔ یہ خط بہت بڑے بادشاہ نے بھیجا تھا۔ یہ ملکہ سبا سے بھی بڑا بادشاہ تھا۔ اس کی لاکھوں کی فوج تھی۔ اس کا دربار لگتا تو کوئی چیز ایسی نہ تھی جو دربار میں حاضری نہ دیتی ہو یہ انسانوں کے علاوہ جنوں اور حیوانوں کا بھی بادشاہ تھا۔ اس کے حکم پر ہَوا بادشاہ کے تخت کو اٹھا کر لے جاتی تھی؛ چرند پرند! تمام جانوروں

کی بولی یہ بادشاہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ چیونٹی تک سے باتیں کرتا۔ پانی کی مچھلیاں بھی اُس کا کہنا مانتی تھیں۔ یہ بادشاہ ایک روز اپنا دربار لگائے بیٹھا تھا۔ چاروں طرف درباری، وزیر، مشیر غرض دربار اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ منعقد تھا۔ اچانک بادشاہ نے حکم دیا ہمارا قاصد لڑاکیسا کہاں ہے۔ سب لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے لیکن کسی کو قاصد کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ سب نے کہا حضور آج وہ غیر حاضر ہے۔ بادشاہ کو بہت غصّہ آیا اور اس نے کہا آج ہم اُسے بغیر اجازت غائب ہونے پر سزا دیں گے یا ذبح کرا دیں گے۔ اگر اُس نے اپنی غیر حاضری کی کوئی معقول وجہ پیش نہ کی بچو! یہ قاصد ہُدہُد ایک چھوٹا سا پرندہ تھا جو بادشاہ کے قافلے سے آگے آگے اُڑتا تھا اور زمین کُرید کر بتاتا تھا کہ پانی کہاں ہے۔ جہاں پانی ہوتا بادشاہ کا قافلہ وہیں پڑاؤ ڈال دیتا تھا۔

سب لوگ سوچ رہے تھے کہ آج ہُدہُد کی زندگی کا آخری دن ہے۔ بادشاہ واقعی اُسے ہلاک کردے گا۔ ابھی دربار شروع ہی ہوا تھا کہ سب نے دیکھا ہُدہُد ہانپتا کانپتا ہوا آیا اور معذرت کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ بادشاہ نے غصّے سے کہا بتاؤ آج بغیر اجازت کہاں گئے تھے۔ ہُدہُد نے اپنے سانس پر قابو پا کر کہا حضور جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔ میں آپ کے لئے بڑی عجیب خبر لایا ہوں۔ بادشاہ نے کہا فوراً بتائی جائے ورنہ تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔

ہُدہُد نے کہا حضور آج میں اُڑتے اُڑتے بہت دُور نکل گیا اور ایک ایسی وادی میں پہنچ گیا جہاں ایک عورت حکومت کرتی ہے اس کا بہت بڑا لشکر ہے۔ ہزاروں وزیر ہیں۔ اس کی خدمت میں سیکڑوں کنیزیں حاضر رہتی ہیں اور اس کے پاس ایک ایسا حسین وجمیل تخت ہے جو ہیرے جواہرات اور سونے سے بنا ہوا ہے۔ لیکن ایک بڑی افسوسناک بات ہے" یہ کہہ کر ہُدہُد خاموش ہوگیا تو بادشاہ نے کہا، آگے بولو وہ کیا بات ہے؟ ہُدہُد نے کہا کہ وہ خوبصورت ملکہ اور اُس کی بستی کے لوگ خدا کی بجائے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ جب سورج نکلتا ہے تو تمام لوگ اسے سجدہ کرتے ہیں اور جب ڈوبتا ہے تب بھی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں خود ملکہ نے اپنے دربار میں ایسی محرابیں بنا رکھی ہیں جن سے روزانہ سورج نکلتا اور ڈوبتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ کہہ کر ہُدہُد خاموش ہوگیا۔ بادشاہ نے ایک گہری سانس لی اور کہا اگر یہ سچ ہے تو میں اس ملکہ کے نام تمہیں ایک خط دیتا ہوں تم ابھی اسے پہنچا کر آؤ۔ بادشاہ نے ملکہ کے نام خط لکھا اور ہُدہُد اپنی چونچ میں پکڑ کر اُڑ گیا اور ملکہ کے دربار میں جا پہنچا جب ملکہ نے خط کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا۔

"یہ خط بادشاہِ وقت کی جانب سے اور اللہ کے نام سے شروع ہے جو بڑا مہربان ہے۔ تم کو ہم پر سرکشی اور سربلندی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اور تم میرے دربار میں خدا کی فرمانبردار بن کر آؤ۔"

ملکہ خط پڑھ کر گھبرا گئی اور سمجھی کہ کوئی بہت ہی بڑی طاقت والا بادشاہ ہے جو ہمیں اپنے دربار میں طلب کر رہا ہے

اس نے اپنے تمام وزیروں کو جمع کیا اور مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے۔ وزیر جنگ نے کہا ملکہ عالیہ آپ بالکل فکر نہ کریں ہمارے پاس زبردست طاقت ہے اگر اس نے حملہ کیا تو ہم اپنی جان کی بازی لگا کر آپ پر قربان ہو جائیں گے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ آگے جو آپ حکم دیں ہم کریں گے۔ ملکہ نے بڑے غور کرنے کے بعد کہا یہ سچ ہے کہ ہم بہت طاقتور ہیں لیکن ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ یہ پیغام ہم تک عجیب طریقے سے آیا ہے اس کا مطلب ہے یا تو وہ صرف بادشاہ ہے یا بہت بڑا بزرگ، میرا خیال ہے میں اپنے قاصدوں کے ذریعے اس کی خدمت میں قیمتی تحفے روانہ کرتی ہوں اس طرح بادشاہ کی نیت کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر وہ سونے کی اینٹیں لے کر خاموش ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر سال اسے نذرانہ دیکر ہم چین سے رہیں گے۔ اور اگر واقعی بڑی طاقت والا ہے تو ہمارا لڑنا فضول ہوگا کیونکہ بادشاہوں کا طریقہ ہے کہ وہ جنگ کر کے شہروں کو برباد کر کے لوگوں کو ذلیل و خوار کرتے ہیں۔ سب وزیروں نے اس رائے کو تسلیم کر لیا آخر ملکہ نے سونے کی اینٹیں، جواہرات وغیرہ دے کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ جب ملکہ کے نمائندے بادشاہ کی خدمت میں آئے اور تحفے پیش کئے تو بادشاہ نے کہا کہ تم اور تمہاری ملکہ میرے پیغام کا غلط مطلب سمجھے تمہاری یہ تمام قیمتی چیزیں میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مجھے میرے اللہ نے اس سے کئی گنا زیادہ چیزیں عطا کی ہیں تم اپنا ہدیہ واپس لے جاؤ اور ملکہ سے کہو میرے پیغام پر عمل کرے۔ ورنہ میں بڑا لشکر لے کر آؤں گا۔ اور تم مقابلہ نہ کر سکو گے اور میں تمہیں شہر بدر کر دوں گا۔

قاصدوں کو بادشاہ کے آدمیوں نے باعزت طور پر سرحد پار کرائی اور ان کی خوب مہمان نوازی کی ان قاصدوں نے اپنی ملکہ سے جا کر سارا ماجرا بیان کیا اور جو کچھ دیکھا بتایا۔ انہوں نے کہا ملکہ عالیہ وہ تو بہت بڑا بادشاہ ہے، صرف انسان ہی نہیں جانور اور جنات تک اس کی رعایا میں شامل ہیں ملکہ نے دل ہی دل میں طے کیا کہ اس بادشاہ سے لڑنا بہت مشکل ہے بہتر یہی ہے کہ اس کا پیغام مان لیا جائے وہ بھی کئی ظالم بادشاہوں کی طرح یہ بھی چاہتا ہے کہ میں اس کی حکومت کو تسلیم کروں اور اس کی رعایا بننا قبول کروں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں یہ سوچ کر وہ ایک نمائندہ وفد لے کر بادشاہ کی طرف چل دی۔

اُدھر ملکہ چلی اِدھر بادشاہ کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ ملکہ آ رہی ہے۔ بادشاہ نے دربار لگایا اور کہا کہ کوئی ہے جو ملکہ کا قیمتی تخت لے کر آئے ایک دیو پیکر جن نے کھڑے ہو کر کہا "حضور میں وہ تخت لے کر حاضر ہو جاؤں گا، دربار ختم ہونے سے پہلے اچانک ایک وزیر نے کہا حضور میں پلک جھپکتے ہی تخت لے آؤں گا۔ جیسے ہی بادشاہ نے گردن موڑی تخت وہاں موجود تھا۔ بادشاہ نے دیکھ کر کہا "یہ تو میرے پروردگار کا فضل ہے وہ آزماتا ہے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری" بادشاہ نے حکم دیا کہ اس تخت میں کچھ تبدیلی کر دی جائے میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ پہچانتی ہے یا نہیں۔ کئی ہفتوں کی مسافت طے کر کے ملکہ بادشاہ کے دربار میں پہنچ گئی۔ بادشاہ نے بڑی عزت کے ساتھ دربار میں بلایا تو ملکہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کا تخت

یہاں کیسے پہنچ گیا۔ اُسے تو وہ کئی تالوں میں بند کر کے سخت پہرہ لگا آئی ہے۔ ملکہ نے عرض کیا میں آپ کے جاہ و جلال سے آگاہ ہو چکی ہوں اور فرمانبردار بن کر حاضر ہوئی ہوں۔ آپ نے یہ تخت منگوا کر اپنی طاقت کا مزید مظاہرہ کیا ہے۔ ہم سب آپ کی وفاداری کا عہد کرتے ہیں۔ ملکہ یہ سمجھ رہی تھی کہ بادشاہ کا مقصد یہی ہے کہ اس کی رعایا کو اپنا فرماں بردار بنا لے۔ لیکن بادشاہ چاہتا تھا کہ وہ مسلمان ہو جائے ملکہ یہ بات نہ سمجھ سکی۔ بادشاہ نے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور ایک عالیشان شیشے کا محل تعمیر کرایا جو موتیوں کی چمک رکھتا تھا اور عقل کو دنگ کر دیتا تھا۔ محل کے صحن میں بڑا حوض کھُدا کر اس میں صاف پانی بھر دیا اور شفاف آبگینوں کے ٹکڑوں سے ایسا نفیس فرش بنوایا کہ دیکھنے والے کی نظر دھوکہ کھا جائے اور سمجھے کہ صحن میں صاف شفاف پانی بہہ رہا ہے۔

بادشاہ نے ملکہ سے کہا کہ وہ اس محل میں قیام کرے۔ جیسے ہی ملکہ وہاں پہنچی تو اس نے دیکھا صحن میں پانی بہہ رہا ہے یہ دیکھ کر ملکہ نے اپنے پائنچوں کو اونچا کیا لیکن بادشاہ نے کہا کہ یہ پانی نہیں صحن آبگینے کا ہے۔ اب ملکہ سمجھی کہ اب تک جو کچھ میں نے دیکھا وہ کسی قاہر بادشاہ کی طاقت کا مظاہرہ نہیں بلکہ یہ بے نظیر طاقت کسی اور ہی نے بادشاہ کو عطا کی ہے اور بادشاہ مجھے اسی طاقت کے کمال دکھا رہا ہے۔ چنانچہ ملکہ نے بادشاہ سے اس کا پیغام پوچھا۔ بادشاہ نے سمجھایا "اے ملکہ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ تم سورج کو پوجتی ہو۔ حالانکہ سورج، چاند اور یہ تمام چیزیں میرے رب کی بنائی ہوئی ہیں، وہی میرا اور میری بادشاہت کا مالک ہے تم بھی اسے ہی اپنا خدا مان لو" ملکہ نے جب یہ سُنا تو بادشاہ سے کہا میں تمہارے خدا پر ایمان لاتی ہوں اور یہ کہہ کر ملکہ نے کلمۂ توحید پڑھ لیا اور مسلمان ہو گئی۔ بچو! اس ملکہ کا نام بلقیس تھا اور اس عظیم المرتبت بادشاہ کا نام حضرت سلیمانؑ تھا جو اللہ کے پیغمبر تھے اور خدا نے انہیں دنیا میں ہر چیز پر حکومت عطا کی تھی۔ اس کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے۔

بعض کُتب اور رسائل میں اکثر ایسی بہت سی معلومات یا معلومات پر مبنی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں، جن کا کوئی مُستند یا مُعتبر حوالہ نہیں ہوتا اور تحقیق پر پتا چلتا ہے کہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان معلومات یا واقعات کو محض کُتب یا رسائل میں شائع ہو جانے کی وجہ سے مستند سمجھ لیا جاتا ہے اور یہ ایک سے دوسرے تک اس طرح منتقل ہوتی رہتی ہیں کہ غلط ہونے کے باوجود ان کے علم کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ "آنکھ مچولی" ایسی معلومات کو اُن کی مکمل صحت کے ساتھ ایسے قارئین تک پہنچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ وہ ایسی معلومات کی اشاعت سے گریز کرے گا، جن کا کوئی مستند حوالہ نہیں ہوگا۔ ہمیں اپنے ساتھیوں سے بھی یہی کہنا ہے کہ وہ جب بھی کوئی معلوماتی تحریر، معلوماتِ عامّہ یا تراشے کی شکل میں کوئی معلومات بھیجیں تو اُس کے ساتھ اُن کُتب یا رسائل کا حوالہ ضرور دیں، جہاں سے ان معلومات کو اخذ کیا گیا ہے۔ غیر مستند معلومات "آنکھ مچولی" میں شائع نہیں کی جا سکیں گی۔

اپنی تحریر ہمیں بھیجنے سے قبل اسے ضرور پڑھ لیجیے!

عہد

ابولاثر حفیظ جالندھری

مجھے ایک ننھا سا لڑکا نہ سمجھو
مجھے اس قدر بھولا بھالا نہ سمجھو
مجھے کھیلنے ہی کا شیدا نہ سمجھو
سمجھتے ہو ایسا، تو ایسا نہ سمجھو

میں طاقت میں رستم سے بہتر بنوں گا
بہادر بنوں گا، دِلاور بنوں گا
میں پڑھ لکھ کے اور دل کا رہبر بنوں گا
ارسطو بنوں گا، سکندر بنوں گا

سبق نیکیوں کے مجھے یاد ہوں گے
بہت سے ہُنر مجھ سے ایجاد ہوں گے
بہت مجھ سے خوش میرے اُستاد ہوں گے
عزیز اور ماں باپ سب شاد ہوں گے

سچائی سے ہرگز نہ شرماؤں گا میں
بھلائی ہر اک سے کیے جاؤں گا میں
مُصیبت میں بالکل نہ گھبراؤں گا میں
بُرائی کی راہوں سے کتراؤں گا میں

میری گفتگو ہو گی ساری کی ساری
بہت اچھی اچھی بہت پیاری پیاری
میں بولوں گا محفل میں جب اپنی باری
تو ہو گی میری بات میں پائداری

نہ میں دل دُکھانے کی باتیں کروں گا
نہ ہرگز رُلانے کی باتیں کروں گا
میں بلکہ ہنسانے کی باتیں کروں گا
دِلوں کو ملانے کی باتیں کروں گا

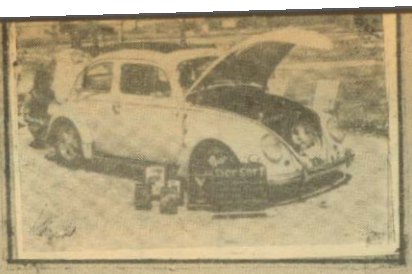

کار کو اتنا بھی بے کار نہ سمجھا جائے

امریکی ریاست ٹیکساس کے شہر ہوسٹن کے ایک فٹ پاتھ پر چلتے چلتے جیک نامی شخص کی نظر آسمان کی جانب اُٹھی تو وہ اپنے ساتھی پیٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلایا: "ارے ... جیک دیکھو آسمان میں واکس ویگن اُڑ رہی ہے"۔ جیک نے چلتے چلتے چونک کر آسمان کی طرف دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جیک نے پیٹر کی جانب گھور کر دیکھا "یقین کرو ابھی ابھی وہ کار عمارتوں کی اوٹ میں چلی گئی ہے"۔ پیٹر نے گھبرا کر کہا "تمہیں جاگتے میں خواب دیکھنے کی عادت کب سے ہو گئی؟" جیک نے مسکراتے ہوئے پیٹر سے کہا۔ پیٹر نے ناگواری سے گردن ہلا دی۔

پیٹر نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا بلکہ اُس نے سچ مچ واکس ویگن کو آسمان میں اُڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ پیٹر کے مشاہدے میں بس ایک کمی رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ آسمان میں واکس ویگن نہیں بلکہ واکس ویگن کے ڈھانچے سے بنایا گیا ہیلی کاپٹر اُڑ رہا تھا۔ یہ عجیب و غریب ہیلی کاپٹر ہوسٹن کے باشندے کرس لیون نے بنایا تھا

کرس لیون ہوسٹن کے ایک ریسٹورینٹ "ورٹینز" کا مالک ہے کرس کے ذہن میں یہ ہیلی کاپٹر بنانے کا خیال اُس وقت آیا تھا جب اُس نے ذاتی استعمال کے لیے پچپن امریکی ڈالر میں ایک واکس ویگن کار خریدی تھی۔ کرس نے اُس واکس ویگن کو ردّو بدل کے بعد ہیلی کاپٹر کی شکل دی۔ کرس نے پہلے کار کی بیرونی شکل تبدیل کی اور پھر اس کے اندر ہیلی کاپٹر کے ضروری آلات اور انجن نصب کیا۔ کار کو ہیلی کاپٹر بنانے پر کرس نے بیس ہزار امریکی ڈالر اور تقریباً ڈیڑھ سال کا وقت صرف کیا۔ جب کار ہیلی کاپٹر کی شکل اختیار کر گئی تو کرس کے ذہن میں ایک اور اچھوتا خیال آیا۔ اُس نے سوچا کہ کیوں نہ اس عجیب و غریب ہیلی کاپٹر کو اپنے ریسٹورنٹ کی شہرت کے لیے استعمال کیا جائے؟ اس خیال کے آتے ہی اُس نے ہیلی کاپٹر پر اپنے ریسٹورینٹ کا نام لکھوا لیا۔ اس وقت یہ عجیب و غریب ہیلی کاپٹر پورے ٹیکساس میں کرس اور اس کے ریسٹورنٹ کی شہرت کا باعث بنا ہوا ہے۔ اگر آپ کبھی ہوسٹن جائیں تو کرس کا یہ عجیب و غریب ہیلی کاپٹر دیکھنا نہ بھولیں۔

اُڑنے والی ووکس ویگین

محمد طاہر سلیم
نارتھ ناظم آباد کراچی

مغرب کے لوگ بھی عجیب ہیں۔ نت نئی باتیں سوچتے رہتے ہیں۔ اب انہی صاحب کو دیکھیے بیٹھے بیٹھے انہیں خیال آیا کہ کیوں نہ یہ جو فوکس ویگن ہے اس کے ڈھانچے سے ہیلی کاپٹر بنایا جائے چلیے صاحب ہیلی کاپٹر بن گیا لیکن آدھے تیتر آدھے بٹیر کی طرح یہ بھی دیکھنے میں آدھی کار اور آدھا ہیلی کاپٹر تھا۔ اس کی تفصیلات دوسرے صفحے پر دی جا رہی ہیں۔ پڑھیے اور دیکھیے کہ یہ بھی کیسے من کی ایجاد ہے۔

دنیا کا پہلا ریفریجریٹر

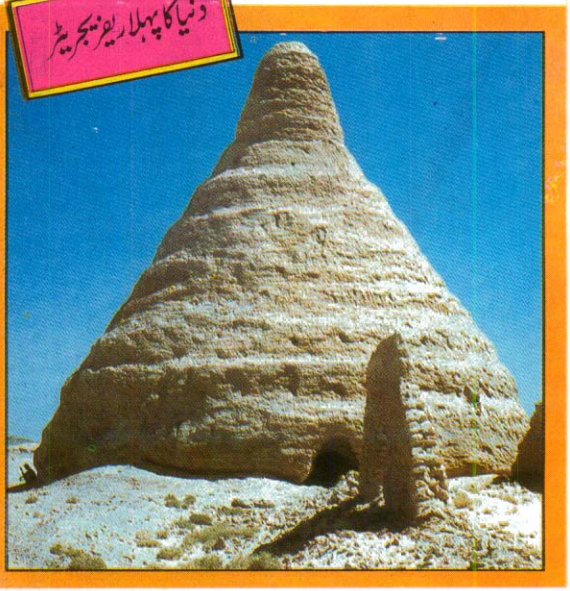

ریفریجریٹر کی ایجاد سے برسوں پہلے ایران کے صحراؤں میں رہنے والے لوگ کچی مٹی کی بنی ہوئی اس طرح کی تکون عمارتوں میں برف ذخیرہ کیا کرتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ برف کہاں سے آتی تھی اور ان میں کیونکر محفوظ رہتی تھی تو ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ سخت سردیوں میں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد پر پہنچ جاتا تھا تو صحرائی لوگ گڑھوں میں پانی ڈال کر جما دیتے اور پھر انہیں ٹکڑوں کی صورت دے کر اس عمارت میں محفوظ کر لیتے۔ ان عمارتوں کی دیواریں اس قدر موٹی ہوا کرتی تھیں کہ تپش ان کے اندر نہیں پہنچ پاتی تھی، یوں گویا برف سال بھر کے لیے محفوظ کر لی جاتی۔ ان عمارات کو فارسی میں "یخ چال" کہتے تھے۔

ادارہ

اپنے دانتوں کو
مزے سے صاف کیجئے

کرسٹل کے تین ذائقے، تینوں مزے دار
کرسٹل ریڈ جیل میں چیری، گرین جیل میں
منٹ اور کرسٹل وہائٹ میں منٹ فریش۔

کرسٹل سے برش کیجئے، ٹوتھ پیسٹ کا مزا
لیجئے دانت ہمیشہ صاف، چمکدار اور کیڑا
لگنے سے محفوظ۔

crystal

سانس خوشگوار، دانت چمکدار

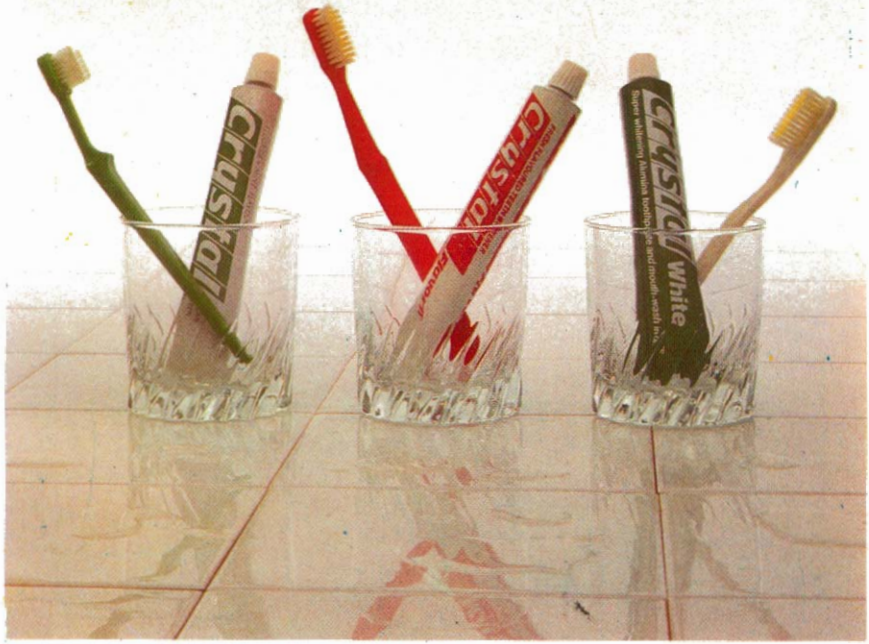

Interflow APL 100

قسط نمبر ۱

عکس

شاہنواز فاروقی

ایک سائنسی کہانی جس کے کردار
آپ کو قدم قدم پر چونکائیں گے۔

۲۹ دسمبر ۲۰۰۴ء

آج میں تقریباً پندرہ برس بعد کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے اسٹیڈیم گیا تھا۔ کرکٹ میرا پسندیدہ کھیل ہے۔ چھٹی کے روز ہماری کالونی کے نزدیکی میدان میں کرکٹ میچ ہوتے ہیں۔ چونکہ میں کالونی کی ٹیم کا ممبر ہوں اس لیے اکثر ان میچوں میں حصہ لیتا ہوں۔ فرصت ہو تو ٹی وی پر کرکٹ میچ خاص طور پر ٹسٹ میچ دیکھنے سے نہیں چوکتا۔ اگر

یہ بھی نہیں کر پاتا تو رات کو ٹی وی پر کرکٹ میچ کی جھلکیاں ضرور دیکھتا ہوں۔ ہاں ... صبح سے لے کر شام تک اسٹیڈیم میں بیٹھ کر میچ دیکھنے کا وقت نہیں مل پاتا ... کیا کروں! ... میوزیم کے منتظم کی نوکری ہی ایسی ہے۔

مگر آج کچھ اور بات تھی۔ آج میرے اسکول کے دنوں کا دوست حارث اپنے کرکٹ کیریئر کا آخری میچ کھیلنے والا تھا۔ اُس نے کل شام اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھ سیزن ٹکٹ اور خط بھیجا تھا۔ خط میں اُس نے بڑی محبت سے درخواست کی تھی کہ میں ہر صورت میں یہ میچ دیکھوں۔ چنانچہ میں یہ ٹیسٹ دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ حارث چونکہ بولر ہے اس لیے میں نے میچ دیکھنے کے لیے اُس دن کا انتخاب کیا جس دن پاکستانی ٹیم فیلڈنگ کر رہی تھی۔

آج میچ کا دوسرا دن تھا۔ پاکستانی ٹیم کل میچ کے پہلے دن ۳۰۷ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی تھی۔ یہ میچ ٹیسٹ سیریز کی ہار جیت کے سلسلے میں فیصلہ کن اہمیت کا حامل تھا۔ توقع کی جا رہی تھی کہ اس بار پاکستان انگلینڈ کو ہرا کر سیریز جیت لے گا۔ کرکٹ کے شائقین کا خیال تھا کہ انگلینڈ کی ٹیم اپنی پہلی اننگز میں چار سو سے پانچ سو کے درمیان رنز بنالے گی۔ کیونکہ انگلینڈ کے بیٹسمین پاکستانی بولروں کے تمام حربوں سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ کرکٹ کے بعض ماہرین کی رائے تھی کہ حارث اور ٹیم کے کچھ دوسرے کھلاڑیوں کو ڈراپ کر کے کچھ نئے اُبھرتے ہوئے کھلاڑیوں کو موقع دینا چاہیے۔ اس مرحلے پر کھلاڑیوں کی صلاحیتوں کا تجزیہ کرنے والے سپر کمپیوٹر نے بھی بعض کھلاڑیوں کو ٹیم سے نکالنے کی سفارش کی، لیکن ٹیم منتخب کرنے والی کمیٹی تجزیاتی کمپیوٹر کی سفارش کے باوجود اس فیصلہ کن میچ کے لیے ٹیم میں اہم تبدیلیاں کرنے پر راضی نہ ہوئی۔ پاکستانی ٹیم کی پہلی اننگز کے اختتام پر کرکٹ کے ماہرین نے خیال ظاہر کیا کہ انگلینڈ کی ٹیم یہ رنز آسانی کے ساتھ بنالے گی۔

ابتدا لگا بھی ایسا ہی۔ انگلینڈ کے اوپننگ کھلاڑیوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ کھیلتے ہوئے پہلے گھنٹے میں چالیس رنز بنالیے۔ پانی کے وقفے کے بعد پاکستانی ٹیم کے کپتان ساجد نے حارث کو گیند دی۔ چونکہ حارث اعلان کر چکا تھا کہ یہ اُس کا آخری میچ ہے اس لیے اسٹیڈیم میں بیٹھے ہوئے تماشائیوں نے زور زور سے تالیاں بجا کر اور ننھی مُنی ہری جھنڈیاں ہلا ہلا کر حارث کی ہمت افزائی کی۔ ہزاروں جھنڈیاں ایک ساتھ ہلیں تو یوں لگا جیسے اسٹیڈیم کے کونے کونے میں گھاس کا ہرا سمندر موجیں مار رہا ہے۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ آنے والے لمحوں میں کیا معجزہ ہونے والا ہے۔

حارث نے گیند سنبھالتے ہی تماشائیوں کو چونکانا شروع کر دیا۔ امپائر کو معلوم تھا کہ حارث رائٹ آرم اوور دی وکٹ گیند کراتا ہے۔ چنانچہ وہ گیند کا سامنا کرنے کے لیے تیار کھڑے بیٹسمین کو اشارے سے یہ بتانے ہی والا تھا کہ حارث نے اُس سے کہا

"میں لیفٹ آرم راؤنڈ دی وکٹ گیند کراؤں گا" یہ کہہ کر وہ فیلڈ ترتیب دینے لگا۔

کپتان ساجد کو بھی معلوم نہیں تھا کہ حارث بائیں ہاتھ سے گیند کرائے گا۔ کیوں کہ حارث نے آج سے پہلے کبھی بائیں ہاتھ سے گیند نہیں پھینکی تھی۔ چنانچہ آج جب اس فیصلہ کُن میچ میں حارث نے بائیں ہاتھ سے گیند کرانے کی تیاری کی تو کپتان ساجد نے ناگواری کے ساتھ منہ بنایا۔ مگر اب گیند دے کر واپس لینا مناسب نہیں تھا۔ پھر اُس نے شاید یہ سوچ کر حارث کو سمجھانے سے بھی گریز کیا کہ یہ اُس کا آخری میچ ہے۔ کیا ہے اگر وہ ایک آدھ اوور یونہی کرادے؟ بہرحال ساجد نے حارث کو بائیں ہاتھ سے گیند کرانے سے منع نہیں کیا اور اس کے بعد ناقابلِ یقین واقعات کا ایک سلسلہ چل نکلا۔

"پاکستانی ٹیم کے لیے یہ اوور شاید مہنگا ثابت ہو" ریڈیو کمنٹیٹر نے حارث کو بائیں ہاتھ سے گیند کراتے دیکھ کر ماہرانہ انداز میں تبصرہ کیا۔ ریڈیو کمنٹیٹر نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ حارث نے اپنے اوور کی پہلی ہی گیند پر انگلینڈ کے عالمی شہرت یافتہ بیٹس مین ولی کو کلین بولڈ کر دیا۔ ولی نے پویلین کی طرف آتے وقت نئے آنے والے بیٹسمین سے کہا۔

"گیند بے ڈھب انداز سے اُچھل رہی ہے --- دھیان سے کھیلنا"

لیکن دو گیندیں کھیل کر نیا کھلاڑی بھی آؤٹ ہو کر پویلین میں جا بیٹھا۔ اسی اوور کی آخری گیند پر حارث نے انگلش ٹیم کے کپتان ٹامس کو آؤٹ کر کے اسٹیڈیم میں موجود ہزاروں تماشائیوں اور پورے ملک میں ریڈیو ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے اَن گنت لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ لیکن یہ تو محض ابتدا تھی۔

حارث کی دائیں ہاتھ کی بولنگ کے عادی بیٹسمین اُس کی بائیں ہاتھ کی بالنگ کے سامنے ڈھیر ہو گئے۔ اور انگلینڈ کی پوری ٹیم پہلی اننگز میں اُناسی رنز اور دوسری اننگز میں پینتالیس رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی حارث کی بولنگ کا تجزیہ حیرت انگیز تھا۔

پہلی اننگز	۱۵ر اوور	۱۰ر میڈن	۱۵ر رنز	۱۰ر وکٹ
دوسری اننگز	۱۰ر اوور	۷ر میڈن	۱۸ر رنز	۱۰ر وکٹ

ٹیسٹ میچ دوسرے دن چائے کے وقفے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ کا یہ انوکھا واقعہ تھا۔ انوکھا اور ناقابلِ یقین۔ حارث کی حیرت انگیز کارکردگی پر مبارک باد دینے کے لیے ہزاروں تماشائی پولیس کے روکنے کے باوجود حفاظتی تار عبور کر کے میدان میں داخل ہو گئے۔ حارث کو تماشائیوں سے بچا کر بڑی مشکل سے پویلین تک لایا گیا۔ میچ کے اختتام کے آدھے گھنٹے بعد بھی میدان کے چاروں کونوں پر لگی ہوئی ویو ہیکل اسکرینوں پر بار بار حارث کی بولنگ کے مناظر سلو موشن میں دکھائے جا رہے تھے۔

اُدھر ریڈیو ٹی وی اور اخبارات کے نمائندے حارث سے انٹرویو کے لیے اُسے گھیرے ہوئے تھے لیکن حارث سب سے بچتا ہوا اسٹیڈیم سے باہر جانے لگا۔ جب اخباری نمائندوں نے اُس سے انٹرویو دینے کے لیے زیادہ اصرار کیا تو حارث نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ۔

"میں ابھی بہت تھکا ہُوا ہوں ... آپ لوگوں سے کل ملاقات ہوگی" یہ کہہ کر حارث اسٹیڈیم کے باہر گیٹ پر کھڑی ہوئی ایمبولینس میں بیٹھ کر نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہوگیا۔ ایمبولینس کو ڈرائیو کر کے لے جانے والا شخص ڈاکٹروں کی طرح کا سفید گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ لوگ تعجب سے جاتی ہوئی ایمبولینس کو دیکھتے رہ گئے۔

حارث جس وقت ایمبولینس میں سوار ہو رہا تھا اُس وقت میرا دل چاہا تھا کہ بڑھ کر اُسے مبارک باد دُوں مگر میری ہمت نہ ہوئی اور میں بھی ہزاروں تماشائیوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اُس کی ایمبولینس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دراصل حارث کی جادوئی کارکردگی نے دوسرے لوگوں کی طرح میرے حواس کو بھی معطّل کر دیا تھا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتے بعد تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ حارث کہاں ہے۔ کرکٹ کنٹرول بورڈ اور پولیس بہت کوششوں کے باوجود حارث کا سراغ لگانے میں ناکام رہے۔ حارث کی یوں اچانک گمشدگی پوری دنیا کے لیے ایک معمّہ بن گئی۔ ایک ہفتے بعد حارث نے کسی انجانے شخص کے ذریعے ملک کے ایک بڑے اخبار کو فون پر اطلاع دی کہ وہ بالکل خیریت سے ہے اور جب تک وہ خود منظرِ عام پر نہ آئے اُسے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی جائے۔ حارث کے بارے میں موصول ہونے والی اس اطلاع نے حارث کی گمشدگی کے اسرار میں مزید اضافہ کر دیا۔

اس دوران کرکٹ کے شائقین اور مبصّر حضرات ٹیسٹ میچ میں حارث کی ناقابلِ یقین کارکردگی پر طرح طرح سے تبصرے کر رہے تھے۔ اخبارات میں حارث کے بارے میں بڑے بڑے فیچر چھپ رہے تھے۔ حارث کی گمشدگی اور پھر اچانک موصول ہونے والے فون کے حوالے سے طرح طرح کے قیاسات پر مبنی خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ اخبار نویس اپنی فطرت اور ضرورت کے مطابق دور کی کوڑیاں لا رہے تھے۔ حارث کی بولنگ کو سلوموشن کے ذریعے بار بار دیکھا جا رہا تھا، لیکن ماہرین کو اُس کی بولنگ میں کوئی تکنیکی خامی نظر نہیں آ رہی تھی۔ حارث کی حیرت انگیز بولنگ کی ویڈیو فلم میچ کے اختتام کی اگلی صبح ہی مارکیٹ میں آگئی تھی اور اب گھر گھر دیکھی جا رہی تھی۔ اُس کی بولنگ دیکھ کر سب یہی کہہ رہے تھے کہ حارث نے بائیں ہاتھ سے لیے بولنگ کی ہے جیسے وہ ہمیشہ سے بائیں ہاتھ سے بولنگ کرنے کا عادی رہا ہو۔ غرضیکہ حارث سو حوالوں سے لوگوں کی گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا۔ ہر شخص کو اب اُس کے منظرِ عام آنے کا انتظار تھا۔

حارث حسبِ وعدہ ایک دن گھر پہنچ گیا۔ وہ جسمانی طور پر بالکل صحت مند نظر آ رہا تھا، لیکن میچ کے اختتام کے بعد

سے منظرِ عام پر آنے تک وہ کہاں رہا اُسے یاد نہیں تھا۔ البتہ اپنی زندگی کا یادگار میچ کھیلنے سے پہلے کی تمام باتیں اُس کے حافظے میں محفوظ تھیں۔ دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اُسے کرکٹ کے میدان میں اپنی بے مثال کارکردگی بھی بالکل یاد نہیں تھی۔ جب کسی نے اُس سے بائیں ہاتھ سے بولنگ کرنے کے متعلق سوال کیا تو وہ اس طرح ہنس دیا جیسے اُس کے لیے یہ نئی اطلاع ہو۔

۵ جنوری ۲۰۰۵ کا دن میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اُس دن صبح سویرے جب میں نہانے سے قبل برش کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں نے ریسیور اُٹھایا تو میرے ایک قریبی دوست فراز کی تصویر ٹیلی فون کے ساتھ نصب منی ٹیلی وژن پر نمودار ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ فراز دس میل کے فاصلے سے فون کر رہا تھا۔ تقریباً پانچ سال بعد فراز سے یہ میرا پہلا رابطہ تھا۔

"ہیلو... دیکھئے مجھے سرمد صاحب سے بات کرنی ہے!"

"ارے فراز ... تم" میں اسکرین پر فراز کی تصویر دیکھ کر چلّا اُٹھا۔

" اچھا تو سرمد ... تم نے مجھے پہچان لیا؟"

"بھئی تمھیں نہیں پہچانیں گے تو کس کو پہچانیں گے؟"

"شکر ہے تم مل گئے ورنہ میں تو ڈر ہی رہا تھا کہ کہیں تمہارا فون نمبر ہی نہ بدل گیا ہو"

"بھئی ہم اسمگلر وغیرہ تو نہیں کہ آئے دن نمبر بدل لیں"

"اسمگلر نہیں تو بڑے افسر تو ہو"

"کیا مطلب ہے تمہارا... اسمگلر اور بڑے افسر میں کوئی فرق نہیں ہوتا؟"

"ہوتا ہے... اسمگلر۔ الف، س، م، گ، ل اور ز سے مل کر بنتا ہے۔ اور افسر۔ الف، ف، س اور ر سے" فراز نے دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا۔

"خیر چھوڑو... یہ بتاؤ کہ فون کیسے کیا؟"

"سرمد کیا آج رات نو بجے کے قریب تم فارغ ہو... میں تم سے ملنا چاہتا ہوں... بہت ضروری کام ہے"

"ہاں ہاں کیوں نہیں... آجاؤ... بلکہ رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھاؤ۔ تمھارے پاس ہمارے گھر کا پتہ تو ہے نا؟" میں نے گرمجوشی کے ساتھ کہا۔

"ہاں پتہ ہے میرے پاس!"

"تو پھر آجاؤ..."

"لیکن بائی دی وے یہ تو بتاؤ کہ آج اتنے دنوں بعد ہماری یاد کیسے آگئی؟" میں نے فراز سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

"یار مجھے حارث کے بارے میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی باتیں ہیں، لیکن میں اس وقت جلدی میں ہوں سب باتیں ملاقات پر بتاؤں گا۔"

فراز فون پر نہایت دھیمی آواز سے بول رہا تھا جیسے اُسے ڈر ہو کہ کوئی اور اُس کی باتیں نہ سُن لے۔

"اور ہاں سنو!" اُس نے خبردار کرنے والے لہجے میں کہا "رات کے کھانے پر کوئی اور موجود نہیں ہونا چاہیے، اور بھابی سے کہہ دینا کہ کھانے کے لیے کانٹے چھری کا بندوبست کر کے رکھیں کیونکہ میں اُن کے بغیر کھانا نہیں کھا سکتا۔" یہ کہہ کر فراز نے تیزی کے ساتھ فون رکھ دیا اور اُس کی تصویر ٹیلی وژن اسکرین سے غائب ہو گئی۔ میں کئی منٹ تک ریسیور کو احمقوں کی طرح ہاتھ میں تھامے کھڑا رہا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ فراز کے آخری فقرے نے مجھے اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

حارث اور فراز میرے بچپن کے دوست تھے۔ ہم نے ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ہمارا یہ مثلث اپنی مخصوص سرگرمیوں کی بنا پر اسکول اور محلّے میں خاصا مشہور تھا۔ اگرچہ ہم تینوں گہرے دوست تھے، لیکن ہم تینوں کے مزاج حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مثلاً میں بہت حسّاس تھا اور شعر و ادب تاریخ و فلسفہ سے دلچسپی رکھتا تھا۔ جبکہ ہر وقت گُم سُم رہنے والے فراز کو سائنس سے لگاؤ تھا۔ اسی طرح ہر وقت ہنسنے مُسکرانے والا حارث کھیلوں کا دیوانہ تھا۔ ہم تینوں کالج تک ساتھ رہے۔ پھر حارث نے کامرس میں گریجویشن کے بعد بینک میں نوکری کر لی۔ اور کرکٹ کے میدان میں جدوجہد کرتا ہوا قومی ٹیم میں شامل ہو گیا۔ میں نے تاریخ میں ماسٹرز کی ڈگری لی جس کے بعد ایک مشہور میوزیم میں مجھے منتظم کے عہدے پر ملازمت مل گئی۔ فراز سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈیفنس لیبارٹری میں ملازم ہو کر خفیہ تحقیقی منصوبے پر کام میں لگ گیا۔ ہم تینوں اپنے کاموں میں اس طرح مصروف ہوئے کہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی عرصۂ دراز سے ایک دوسرے سے نہیں مل پاتے تھے، شہری زندگی کا سب سے بڑا عذاب یہی ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہوئے بھی دُور ہوتے ہیں۔

میرا سارا دن اِسی سوچ میں گزرا کہ فراز حارث کے بارے میں مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟ کیا اُسے حارث کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم ہے جو اب تک منظرِ عام پر نہیں آ سکی؟ ایسے ہی سوالات پر غور کرتے کرتے رات ہو گئی۔

متحد ہونا اک عبادت ہے

نفیس فریدی

اے مرے پھول سے حسیں بچّو
میرے گلشن کی تم ہی زینت ہو

علم سے اپنا واسطہ رکھّو
خوب پڑھ لکھ کے اپنا نام کرو

تم ہو معمارِ وقتِ آئندہ
ملک و ملّت ہے تم سے تابندہ

آج تم سے بھی ہے یہی کہنا
پیارو آپس میں متّحد رہنا

رکھنا فکرِ بلند، عزمِ صمیم
اور اپنی روایتی تنظیم

ایسی تنظیم جس کے دَم خم سے
زیر ہر دم رہے ہنُود ہم سے

اتّحاد اپنا دیکھ کر تھے دنگ
صاحبِ اقتدار یعنی فرنگ

ایک آواز ہو گئے تھے ہم
ایک نعرہ ہمارا تھا ہر دم

ہم نے جدّوجہد وہ کی مِل کر
ہند کی دھرتی رہ گئی ہِل کر

کام ہم سب نے وہ کئے ڈٹ کر
ہند دو ٹکڑے ہو گیا بٹ کر

تھے جُدا مِل کے سب ہوئے یک جان
متّحد ہو کے پایا پاکستان

کامرانی و کامیابی کا!
یاں یہی راز ہے ترقّی کا!

متّحد ہونا اک عبادت ہے
مِل کے رہنا بڑی سعادت ہے

نعمتوں میں عظیم نعمت ہے
طاقتوں میں بڑی یہ طاقت ہے

جہاں قالین وہیں صفائی

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری، کراچی

ہیڈ آفس:
عبداللہ ہارون روڈ فون: ۵۱۱۷۱۱

شاخیں:

- بہادر آباد فون: ۴۱۳۶۹۵
- ڈیفنس فیز V فون: ۵۲۶۵۳۹
- جمشید روڈ " ۴۱۱۳۰۲
- امیر خسرو روڈ " ۴۱۲۶۹۵
- کھارادر " ۲۲۵۸۰۳
- راشد منہاس روڈ " ۴۱۱۳۰۲
- گارڈن روڈ " ۷۲۲۴۳۳
- حسن اسکوائر " ۵۲۶۵۳۹
- برنس روڈ ۲۰۲۳۲۶

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری

ہیڈ آفس: عبداللہ ہارون روڈ، کراچی فون ۵۱۱۷۱۱ ۵۲۶۵۳۹

زونل آفس: صدر بازار۔ راولپنڈی فون ۶۷۹۸۸ ۶۳۲۵۰

میں شاعر بنوں گا

وہ شاعر بننا چاہتا تھا
لیکن بڑی اماں شاعری کو
بے کاری کا مشغلہ سمجھتی تھیں۔

محمد جاوید خالد

"چلو شعیب اب اُٹھ جاؤ۔ بہت سو لئے" امی نے شعیب کو اٹھاتے ہوئے کہا "دیکھو دھوپ کمرے میں آرہی ہے۔ آج تو تم نے چڑیوں کا صبح کا گیت بھی نہیں سنا۔

"چڑیاں آئی تھیں"؟ شعیب نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

اور نہیں تو کیا" امی نے جواب دیا" وہ آئیں گیت سنایا اور یہ کہتی ہوئی اڑ گئیں کہ شعیب تو گندا بچہ ہے دیر تک سوتا ہے۔"

"اچھا یہ کہا انہوں نے" شعیب میاں نے پوری آنکھیں کھول دیں۔

"ہاں" امی نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے آج میں اپنے پاس غلیل رکھ کر سوؤں گا اور صبح اٹھتے ہی چڑیوں کی خبر لوں گا۔

یہ کہہ کر شعیب میاں نے کروٹ بدلی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"اٹھ جا نشانے باز" امی نے ایک چپت لگائی۔

"امی آٹھ بجے اٹھوں گا۔" شعیب نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔

"ارے اب تو سوا آٹھ ہو گئے ہیں" امی پھر بولیں۔

"تو پھر نو بجے اُٹھوں گا" شعیب میاں نے اعلان کیا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ ابھی اُٹھو ورنہ سبق کا ناغہ ہو جائے گا" امی کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"مگر امی مس تو تین دن کے لئے اپنی خالہ کے ہاں گئی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں اردو کا قاعدہ لو اور مولوی صاحب کے پاس جاؤ۔ چھٹی کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

"اٹھو ورنہ پانی کا جگ بھر کر لا رہی ہوں۔"

امی کا یہ ہتھیار ایسا تھا کہ شعیب کو اٹھنا ہی پڑتا تھا۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر شعیب میاں نے قاعدہ اٹھایا۔ ٹوپی سر پر جمائی امی نے ان کا ماتھا چوما اور کہا "مولوی صاحب سے کہنا میں پڑھنے آیا ہوں۔ امی نے بھیجا ہے۔"

مولوی صاحب کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ شعیب نے جا کر زور سے کہا السلام علیکم۔ تو وہ چونک گئے۔

"آؤ! بیٹے آؤ!! کیسے آئے؟" مولوی صاحب نے پوچھا۔ شعیب میاں جھٹ سے بولے۔ "پڑھنے آیا ہوں۔ امی نے بھیجا ہے۔ ہماری مس چھٹی پر گئی ہیں۔"

"اچھا اچھا!!!" مولوی صاحب نے سر ہلایا "آؤ بیٹھو۔ شاباش کیا پڑھو گے؟"

"یہ قاعدہ کچھ پڑھا بھی ہے"؟ مولوی صاحب نے پوچھا؟

"ہاں مجھے یہاں تک آتا ہے" شعیب نے جلدی جلدی صفحے الٹتے ہوئے ایک سبق پر انگلی رکھ دی۔

"بہت خوب"! مولوی صاحب بولے "مجھے ذرا شروع سے سناؤ تو" اور شعیب میاں نے فر فر پڑھنا شروع کر دیا۔ نظم ختم ہوئی تو کہانی شروع ہو گئی۔ مولوی صاحب نے روک دیا۔ "بیگم سنا تم نے وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ہاں سن رہی ہوں" ان کی بیگم نے جواب دیا۔

"یہ بچہ شاعر بنے گا" مولوی صاحب بولے۔

"اچھا! وہ کیسے" بیگم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس کا نظم پڑھنے کا انداز۔ ہاں بیٹے ذرا دوبارہ پڑھو یہ صفحہ"۔ مولوی صاحب نے شعیب سے کہا۔

شعیب پڑھ چکا تو وہ پھر بولے "دیکھا تم نے یہ لڑکا شاعر بنے گا شاعر۔"

شعیب میاں کو یہ تو پتہ نہیں تھا کہ شاعر کیا ہوتا ہے؟ البتہ وہ اتنا ضرور سمجھ گئے کہ کچھ خاص چیز ہے جو وہ کریں گے۔ ان کے پورے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ آگے سبق لینا مشکل ہو گیا۔ "یہ لڑکا شاعر بنے گا۔" یہ فقرہ بار بار ان کے ذہن میں گونجتا رہا اور جوں ہی چھٹی ملی شعیب میاں دوڑے سیدھے گھر کی طرف۔ امّی صحن میں ہی بیٹھی تھیں۔ شعیب میاں سیدھے ان کی گود میں جا گرے اور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "امی کچھ پتہ ہے میں شاعر بنوں گا۔"

امّی نے جھک کر شعیب کا خوشی سے لال چہرہ چوم لیا۔ شعیب میاں پھر جوش سے بولے میں شاعر بنوں گا۔ مولوی صاحب کہہ رہے تھے۔" اور اس کے ساتھ انہوں نے پورا واقعہ دہرایا۔ امی مسکراتی رہیں تھوڑی دیر بعد شعیب میاں نے منہ اوپر اٹھایا۔ "امّی شاعر کیا ہوتا ہے۔" شعیب نے پوچھا۔ امّی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ تو مجھے بھی پتہ نہیں" اسی وقت بڑی اماں اندر سے نکلیں۔ "ماں بیٹے میں کیا راز کی باتیں ہو رہی ہیں؟" انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ شعیب میاں جھٹ اچھلے۔ "بڑی اماں! بڑی اماں! میں شاعر بنوں گا" انہوں نے پھولی ہوئی سانس سے کہا۔

"اے خدا نہ کرے تم شاعر بنو۔ موئے کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔ جسے اور کوئی کام نہ ہو شاعر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے اور لکھیں گے فلموں کے گانے۔ بے حیائی کی پوٹ لاحول ولا قوۃ۔" اور شعیب میاں کا سارا جوش پانی کے جھاگ کی طرح ختم ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر صحن میں بچھے تخت پر اداس چہرہ لئے بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے کہ امی یا بڑی اماں کچھ کہتیں، دروازے کی گھنٹی بجی اور ماموں جان کی مخصوص آواز سنائی دی۔ "شعیب، شعیب بیٹے" مگر شعیب میاں چپکے بیٹھے رہے۔ حالانکہ ان کی عادت تھی کہ یہ آواز سن کر وہ دروازے کی طرف دوڑتے اور ماموں سے پہلا سوال یہ کرتے "میرے لئے کیا لائے؟"

"کہاں گیا ہے شعیب"؟ ماموں اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔ اندر آئے تو تخت پر اداس بیٹھے ہوئے شعیب پر نظر پڑی۔ "ارے کیا ہوا بھئی؟ دیکھو میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں۔

یہ لال لال سیب ہیں اور یہ کتاب ہے" علامہ اقبال کی بچوں کے لئے نظمیں"۔ مگر شعیب میاں ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"کیا ماجرا ہے بھئی" انہوں نے امی کی طرف رُخ کیا اور امّی نے ہنستے ہنستے سارا واقعہ سنا دیا ماموں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ شعیب کو بازوں سے پکڑ کر اوپر اچھالا اور پھر دبوچتے ہوئے بولے "واہ بھئی واہ ہمارا بیٹا شاعر بنے گا۔ کیا مزے کی بات ہے"!

شعیب میاں نے چونک کر ماموں کی طرف دیکھا لیکن ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی بڑی اماں بول پڑیں

"کیا کہہ رہا ہے تو"؟

ہاں اماں کیسی اچھی بات ہے ہمارا بیٹا شاعر بنے گا۔ آپ بیٹھیں تو سہی میں آپ کو بتاتا ہوں"

شعیب میاں کے چہرے پر کچھ رونق نظر آئی ماموں نے اسے گود میں بٹھالیا۔ اب ماموں نے کتاب اٹھائی اور بولے" دیکھیں اماں جو شعر کہے اسے شاعر کہتے ہیں اب میں آپ کو کچھ شعر سناتا ہوں، سُنیں۔

شعر

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

اور ـــــــ میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو!
نیک جو راہ ہو اسی راہ پہ چلانا مجھ کو!

ایک اور سنیں ـــــــ ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

"یہ کیسے شعر ہیں"؟ انہوں نے بڑی اماں سے سوال کیا۔

"یہ تو اچھی باتیں ہیں مگر"......

"مگر کیا بڑی اماں یہ ضروری تھوڑی ہے کہ ہر شاعر بیکار باتیں کہے" پھر وہ شعیب کی طرف متوجہ ہوئے۔ دیکھو بیٹے انہوں نے کہا۔ "کوئی چیز بذاتِ خود بُری نہیں ہوتی بلکہ اس کا غلط استعمال اسے بُرا بناتا ہے اور اسے صحیح طرح استعمال کیا جائے تو بُری چیز بھی اچھی بن سکتی ہے۔ سمجھ میں آئی بات"

شعیب میاں کی سمجھ میں کچھ آیا کچھ نہ آیا مگر انہوں نے سر ضرور اقرار میں ہلا دیا۔

"اس کی مثال تم یوں سمجھو"۔ ماموں پھر بولے۔ "کہ نفرت کرنا بُری بات ہے مگر جو اللہ کے اس کے رسولؐ کے دشمن ہوں ان سے ضرور نفرت کرنی چاہیئے۔ اسی طرح غصّہ بُرے کاموں میں شامل ہوتا ہے مگر وطن کو نقصان پہنچانے والوں پر غصّہ ضرور آنا چاہیئے۔ تو تم نے دیکھا کہ صحیح استعمال سے 'نفرت' اور 'غصہ' بھی ٹھیک کام ہوگئے۔ شاعری تو بڑی اچھی چیز ہے اور میرا بیٹا بہت اچھے اچھے شعر کہے گا کیوں بھئی"؟

اب تو بات شعیب میاں کی سمجھ میں پوری طرح آگئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور انہوں نے زور زور سے سر ہلانا شروع کر دیا۔

"تو میرا بیٹا کیا بنے گا"؟ امی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

شعیب میاں نے لپک کر سیب اٹھایا اور باہر کی طرف دوڑتے ہوئے زور سے بولے،

"میں شاعر بنوں گا" ماموں، بڑی اماں اور امی تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اگر آپ کوئی مضمون
لکھنا چاہتے ہیں
تو پھر اس تحریر
کو ضرور پڑھیئے!

لکھنے سے پہلے

طاہر مسعود

ایک "آنکھ مچولی" ہی کیا ہر رسالے کے دفتر میں سینکڑوں تحریریں چھپنے کے لیے بھیجی جاتی ہیں لیکن ان میں سے چند ہی تحریریں اشاعت کے قابل ہوتی ہیں اور بقیہ سب کی سب ردّی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی ہیں۔ ان مضامین کے لکھنے والوں کی جانب سے جب اپنی تحریروں کی اشاعت پر اصرار کیا جاتا ہے تو رسالے کے مدیر کی طرف سے انہیں دو سطری جواب موصول ہوتا ہے کہ "چونکہ آپ کی تحریر معیاری نہیں تھی اس لیے شائع نہیں ہو سکی۔"

اکثر نئے لکھنے والے اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ ایک تحریر معیاری کیونکر کہلاتی ہے؟ وہ کون سی خوبیاں ہیں۔ جو اگر موجود ہوں تو تحریر اشاعت کے قابل ہوتی ہے بصورتِ دیگر اسے اُٹھا کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا جاتا ہے۔

بے شک لکھنے لکھانے کا شوق اہمیت رکھتا ہے، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ محض شوق کی بدولت آپ لکھنا لکھانا نہیں سیکھ سکتے۔ لکھنے کا فن چند تقاضوں کا پابند ہوتا ہے جب تک آپ ان اصولوں اور تقاضوں سے واقف نہیں ہوتے لکھنے کے فن پر آپ کو قدرت حاصل نہیں ہو سکتی اور صرف لکھنے کا فن ہی کیا دنیا کے تمام علوم و فنون کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ سنگ تراشی، مصوری، موسیقی سے لے کر عمارت سازی اور گاڑی کے پُرزوں کی مرمت تک ہر کام سیکھنے کا محتاج ہے۔۔۔ لکھنے لکھانے کا فن بھی سیکھنا پڑتا ہے اور اس کے لیے بھی مشق اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب آپ لکھنے کی مشق کی ابتدا کریں گے تو آہستہ آہستہ اپنی غلطیوں سے خود سیکھنے لگیں گے۔

یاد رکھیے کوئی بھی تحریر دو عناصر کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ایک تو خیال دوسرے زبان و بیان۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی تحریر میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کہا گیا ہے؟ اور پھر یہ کہ کیسے کہا گیا ہے؟

تحریر میں پہلے عنصر یعنی خیال دراصل اس مواد کو کہتے ہیں جو کسی مضمون میں پیش کیا جاتا ہے۔ فرض کیجیے آپ انسان کے چاند پر پہنچنے کے موضوع پر ایک معلوماتی مضمون لکھنا چاہتے ہیں۔ اب اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے

پاس اس موضوع پر تمام اہم معلومات موجود ہوں۔ مثلاً یہ کہ چاند کے متعلق انسانوں کی روایتی تصورات کیا تھے؟ چاند کے متعلق جدید سائنس کیا کہتی ہے؟ چاند پر جو سائنسدان پہنچے ان کے مشاہدات و تجربات کیا تھے؟ وغیرہ

یہ تمام معلومات آپ کے مضمون کا مواد ہیں۔ ظاہر ہے اس مواد کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو بہت سوچ بچار اور مطالعے کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ جب آپ اس موضوع پر مطالعہ کریں گے تو آپ کی معلومات وسیع ہوگی۔ آپ دیکھیں گے کہ تاریخ انسانی میں "چاند" کے متعلق کیسے عجیب و غریب تصورات رہے ہیں۔ شاعروں نے اس کے متعلق کیسے حسین و جمیل خیالات ظاہر کیے ہیں، لیکن سائنس نے ان خیالات و تصورات کو بالکل غلط ثابت کر دیا اور صرف یہی موضوع نہیں بلکہ آپ لکھنے کے لیے کسی بھی موضوع کا انتخاب کریں خواہ وہ سائنس سے متعلق ہو یا ادب سے، مذہب کے حوالے سے ہو یا تاریخ سے، ہر ایک موضوع کے ساتھ یہی ہے آپ اس کے متعلق جتنا زیادہ مطالعہ کریں گے۔ اس کے مختلف پہلوؤں سے آپ واقف ہوتے جائیں گے اور اس موضوع پر آپ کی اپنی ایک رائے قائم ہوگی اور مزید غور و فکر سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ آپ کو اس موضوع پر کیا کہنا یا کیا لکھنا چاہیے۔ لہٰذا پہلا اصول تو یہ معلوم ہوا کہ لکھنے کے لیے مطالعہ اور غور و فکر اشد ضروری ہے۔ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ اس کی ضرورت صرف نو آموز لکھنے والوں کو ہوتی ہے۔ کہنہ مشق لکھنے والے بھی لکھنے کے لیے انہی مرحلوں سے گزرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ زیادہ وسیع ہوتا ہے اور مسائل و موضوعات پر ان کے خیالات میں پختگی اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ فرق ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص جو ابھی گاڑی چلانا سیکھ رہا ہو اور ایک وہ شخص جو ماہر ڈرائیور ہو۔ نئے لکھنے والے محنت سے بہت جلد اس مقام پر پہنچ سکتے ہیں۔

جب کسی موضوع پر مطالعے اور غور و فکر کے ذریعے مواد جمع کرنے کا کام مکمل ہو جائے تب لکھنے کا مرحلہ آتا ہے۔ اس وقت یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ کیسے لکھا جائے؟ لیکن یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں۔ کیوں کہ جب آپ کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے تو سمجھیے کہ بڑی حد تک مسئلہ حل ہو گیا۔ اکثر نئے لکھنے والوں کو اس دشواری کا سامنا رہتا ہے کہ مضمون کا آغاز کیسے کیا جائے؟ جو معلومات موضوع سے متعلق موجود ہیں انھیں الفاظ کا جامہ کیسے پہنایا جائے؟ کہا جاتا ہے کہ الفاظ کے پیچھے مت بھاگو۔ خیالات تلاش کرو۔ اگر تمھارے پاس خیالات ہوں گے تو الفاظ تمھارے اردگرد ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے۔ جب آپ لکھنے بیٹھیں گے اور آپ کے پاس موضوع سے متعلق معلومات موجود ہوں گی تو دو تین مرتبہ کی کوشش کے بعد آپ اس اسلوب کو خود ہی تلاش کر لیں گے جس کے ذریعے آپ کو اپنی بات کہنی ہے۔ اسلوب کا مطلب ہے بات کہنے کا طریقہ۔ یہ طریقہ بھی مسلسل مطالعے ہی سے لکھنے والا سیکھتا ہے۔ جب آپ اچھے لکھنے والوں کی تحریریں غور سے پڑھیں گے اور یہ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ وہ کسی بات کو کس طرح بیان کرتے ہیں تو آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز میں بہت کچھ سیکھتے جائیں گے۔ ان کا اسلوب تحریر آپ کے انداز تحریر کو متاثر کرے گا اور پھر آپ کو یہ شکایت نہیں ہوگی کہ آپ مضمون کا آغاز اور اختتام کس طرح کریں۔

بعض نئے لکھنے والے اپنی تحریر کے متعلق مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب ان کا مضمون شائع نہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنی چاہیے۔ ضروری نہیں کہ ہر لکھی جانے والی چیز اشاعت کے لائق بھی ہو۔ اکثر بزرگ لکھنے والوں کی تحریریں بھی کسی نہ کسی وجہ سے شائع نہیں ہو پاتیں۔ کسی مضمون کو شائع کرانے کے لیے بھی چند ضروری باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اوّل :۔ آپ کے مضمون کو معیاری ہونا چاہیے۔ دوئم :۔ آپ کے مضمون کو اس رسالے کے مزاج اور ضروریات کے مطابق ہونا چاہیے جس کے لیے آپ مضمون لکھ رہے ہیں۔ ایک مذہبی رسالے میں اگر آپ کھیل سے متعلق کوئی مضمون بھیجیں گے تو ظاہر ہے وہ مضمون شائع نہیں ہو سکے گا۔ سوئم :۔ آپ کے مضمون کو صاف، خوش خط، حاشیے اور سطر چھوڑ کر کاغذ کے ایک طرف لکھا ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ آسانی سے پڑھا جا سکے اور ایڈیٹر اگر اس میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنا چاہے تو سہولت سے کر سکے۔ چہارم :۔ اگر مضمون پھر بھی شائع نہ ہو تو مشتعل ہونے کے بجائے ایڈیٹر سے اس کے شائع نہ کرنے کی وجہ پوچھنی چاہیے --- یاد رکھیے کہ ایک اچھا مضمون ہر رسالے کی ضرورت ہوتا ہے۔ اگر آپ کا مضمون شائع نہ ہو تو ضرور اس میں کوئی نہ کوئی نقص ہوگا۔ اس نقص یا خامی کو تلاش کرنا چاہیے نا کہ رسالے کے مدیر کو مورد الزام ٹھہرانا چاہیے۔ جیسا کہ اکثر نئے لکھنے والوں کی عادت ہوتی ہے۔

اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب آپ اپنا مضمون مکمل کر لیں تو اُسے کسی ایسے شخص کو دکھا لیں جو آپ کی رہنمائی کر سکتا ہو۔ اس کے بعد جو تحریر آپ چھپنے کے لیے بھیجیں گے کوئی وجہ نہیں کہ شائع نہ ہو۔

مضمون نگاری کے سلسلے میں اگر آپ نے یہ چند ایک ضروری باتیں ذہن نشین کر لی ہیں تو پھر انشاء اللہ ہم آئندہ کسی مضمون میں یہ بھی بتانے کی کوشش کریں گے کہ ایک مؤثر مضمون لکھنے کے کون کون سے طریقے ہیں؟ اور ایک مضمون لکھنے کا خاکہ کس طرح تیار کیا جاتا ہے؟

تعلیم الاسلام ۴ حصے

اسلام کی بنیادی معلومات
جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے

تالیف :۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب

تعلیم الاسلام کے چاروں حصے مفت منگوانے کے لیے
صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجئے۔

فطرت اور انسان

نیوٹن نے سیب کو زمین پر گرتے دیکھ کر سوچا تھا کہ سیب پیڑ سے ٹوٹ کر نیچے ہی کیوں گرا اوپر کیوں نہیں گیا۔ سیب کے زمین پر گرنے کے عمل پر غور کرنے سے نیوٹن نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ زمین کے اندر کوئی قوت ایسی ہے جو سیب کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ نیوٹن نے بعد میں اس نکتے پر غور و خوض کے بعد کششِ ثقل کا قانون دریافت کیا تھا۔

فطری مظاہر ہمیشہ سے انسانی تخیل کو مہمیز دے کر اُسے نئی نئی چیزیں ایجاد و اختراع کرنے پر مائل کرتے رہے ہیں۔ آج دنیا میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جنہیں بلا مبالغہ فطرت کے مختلف مظاہر کی نقل کہا جاسکتا ہے اس اعتبار سے فطرت انسان کی سب سے بڑی استاد ہے۔ البتہ یہ اُستاد ذہانت اور کھلی آنکھیں رکھنے والوں کو ہی اپنی شاگردی میں قبول کرتا ہے۔

فطری مظاہر میں (جنہیں ہم فطرت کی ایجادات بھی کہہ سکتے ہیں) پرندے اور پانی کے مختلف جانور بھی شامل ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ فطرت کی یہ ایجادات انسانی ایجادات سے کتنی مماثلت رکھتی ہیں تاکہ ہم جان سکیں کہ انسان نے فطرت سے کیا کیا کچھ سیکھا ہے۔

جیٹ طیارے کو زمین سے فضا میں پرواز کرتے دیکھ کر شاید ہی کبھی آپ کے ذہن میں آکٹوپس (آٹھ پاؤں والا سمندری کیڑا) کا خیال آیا ہو۔ حالانکہ جیٹ طیارہ اُڑنے سے پہلے اور آکٹوپس چلنے سے پہلے ایک جیسے مخصوص عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مثلاً جیٹ طیارہ اُڑنے سے قبل اپنے پچھلے حصے سے گیس خارج کرتا ہے۔ یہ گیس طیارے کو دھکیل کر فضا میں اُڑنے میں مدد دیتی ہے۔ اسی طرح آکٹوپس چلنے سے پہلے پانی کی کچھ مقدار اپنے جسم میں داخل کرکے اُسے اپنے جسم کے پچھلے حصّے سے خارج کرتا ہے۔ اس عمل سے اُسے جیٹ طیارے کی قوت حاصل ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ پانی میں تیرنے لگتا ہے۔

اسی طرح "ہمنگ" نام کی چڑیا اُڑتے اُڑتے انہیں چونچ کے ذریعے پھولوں سے رس حاصل کرتی ہے۔ چڑیا کا یہ عمل فضا میں ایک طیارے کو دوسرے طیارے کے ذریعے پٹرول فراہم کرنے کے عمل سے ملتا جلتا ہے۔

سامنے والے صفحے پر ۱۲ تصاویر آپ کے مشاہدے کے لیے شائع کی جارہی ہیں۔ ان میں چھ تصاویر پر B سے G تک کے حروف لکھے ہوئے ہیں جبکہ ۶ تصاویر پر ۲ سے ۷ تک کے اعداد درج ہیں۔ حروف والی تصاویر کا اعداد والی تصاویر سے گہرا تعلق ہے۔ آپ کو یہ بتانا ہے کہ حروف والی کس تصویر کا اعداد والی کس تصویر سے ایک خاص تعلق ہے؟ آپ کی آسانی کے لیے ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ بہت سے فطری مناظر بہت سی انسانی ایجادات کا باعث ہوئے۔

فطرت سے کس نے کیا سیکھا—؟

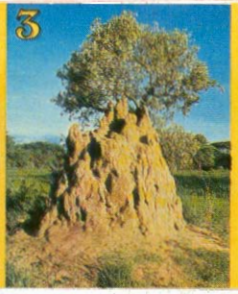

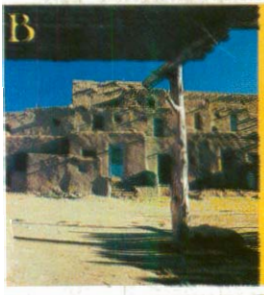

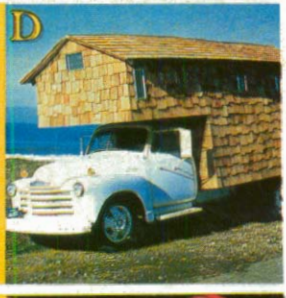

کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے

واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ

احمد کے حلوہ جات

ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے

MASS

اُس دن مجھے اسکول جانے میں بہت دیر ہوگئی تھی۔ میں ڈر رہا تھا کہ آج ضرور مجھے ڈانٹ پڑے گی۔ میں تیز تیز چلنے کے بجائے دوڑنے لگا تاکہ جلد از جلد اسکول پہنچ جاؤں۔ قصبے کے ٹاؤن ہال کے پاس مجھے کچھ لوگ نظر آئے جو وہاں لگے نوٹس بورڈ پر کچھ پڑھ رہے تھے۔ مجھے قصبے کے لوہار نے آواز دی اور کہا۔

آخری کلاس

خورشید عالم

انگریزی زبان سے مرعوب ہونے والوں کے لیے ایک کہانی۔

"بیٹے آرام سے جاؤ۔ تمھیں دیر نہیں ہوگی۔ اس طرح تم تھک جاؤ گے۔" میں نے اُس کی بات سُن لی مگر اپنی دُھن میں آگے بڑھتا ہی گیا۔ اسکول کے قریب پہنچ کر عجیب سی خاموشی کا احساس ہُوا۔ ورنہ اُس وقت تو اسکول میں سارے لڑکے زور زور سے سبق یاد کر رہے ہوتے ہیں اور اتنا شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ مگر اتنی خاموشی

سوائے چھٹی کے کبھی نہیں ہوتی۔ اپنی کلاس کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ سرجان چھڑی بغل میں دبائے سوچ میں گم ٹہل رہے ہیں۔ میرے دوسرے ہم جماعت ساتھی نہایت خاموشی سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ سر نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور نہایت مدھم لہجے میں بولے۔

"اپنی سیٹ پر جاکر بیٹھ جاؤ"۔ میں دل میں شکر ادا کرتا ہوا اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مگر کلاس کا ماحول اور سرجان کی خاموشی میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میری کلاس کی پچھلی نشستیں جو عام طور پر خالی ہوتی تھیں ان پر مجھے اپنے قصبے کے کچھ لوگ بیٹھے نظر آئے۔ ان میں ہمارے قصبے کے میئر اور پوسٹ ماسٹر بھی موجود تھے۔ وہ سب لوگ بڑے ہی اداس انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی میں گردن گھما گھما کر سب کو دیکھ ہی رہا تھا کہ سرجان کی مخصوص آواز سنائی دی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا وہ کہہ رہے تھے۔

"میرے عزیز طالب علموں! آج میں تمہاری آخری کلاس لے رہا ہوں۔ کل ہی برلن سے حکم نامہ آیا ہے کہ آئندہ اس اسکول میں سوائے جرمن زبان کے اور کچھ نہیں پڑھایا جائے گا۔ کل سے ایک نئے اُستاد آرہے ہیں جو تم لوگوں کو جرمن زبان پڑھائیں گے۔ تم لوگوں کو دوسرے مضامین بھی اس زبان میں پڑھنا ہوں گے۔ آج فرانسیسی زبان کی اس اسکول میں آخری کلاس ہے۔ اس لیے اس آخری سبق کو نہایت توجہ سے سنو"۔

میں سرجان کی یہ بات سُن کر دنگ رہ گیا۔ سرجان اپنی موٹی سی چھڑی اور تمام ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ کہیں اور چلے جائیں گے۔ میں اس لمحے ان کی دی ہوئی تمام سزاؤں کو بھول گیا۔ اب مجھے پتا چل گیا کہ کلاس میں کیوں اتنا سناٹا چھایا ہُوا ہے اور پچھلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے افراد اتنے اداس کیوں نظر آرہے ہیں۔ مجھے ٹاؤن ہال کے نوٹس بورڈ پر موجود افراد کا مطلب بھی سمجھ میں آگیا۔ وہ لوگ یہی حکم نامہ پڑھ رہے ہوں گے جس کی بابت سرجان نے بتایا ہے۔ سرجان اس قصبے کے اسکول میں تیس برس سے پڑھا رہے تھے۔ یہاں کا ہر فرد ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ سرجان نے مجھے مخاطب کرکے کہا۔

"فرانز تم سبق کو بلند آواز سے پڑھ کر سناؤ"۔

میں کھڑا ہوا اور کتاب ہاتھ میں پکڑ کر بلند آواز سے سبق پڑھنا شروع کیا۔ پڑھنے کے دوران پہلی مرتبہ مجھ سے اس روز کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ البتہ میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ جب میں نے سبق مکمل کیا تو سرجان نے بولنا شروع کیا۔

"تم لوگوں نے دیکھا کہ اپنی زبان میں پڑھنا اور لکھنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ مگر کل لوگ ہم سے پوچھیں گے کہ تم نے اپنے فرانسیسی ہونے کا کیا ثبوت دیا۔ تمہارے بچے اب اپنی زبان پڑھنا اور لکھنا بھی نہیں جانتے۔ ہماری زبان کتنی اچھی ہے۔ جس نے ہمیں متحد کر رکھا ہے۔ کوئی بھی قوم غلامی کے باوجود اگر اپنی زبان ترک نہ کرے تو وہ ایک نہ ایک دن ضرور آزادی کی

صبح طلوع ہوتے دیکھے گی۔"

سرجان کی ایک ایک بات میرے دل میں اُترتی جا رہی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں املا کی تیاری کے لیے کہا اور ہم سب لڑکوں کو ایک ایک نئی چھپی ہوئی کاپی دی۔ اس کاپی کے ہر صفحے پر کونے میں نمایاں طور پر "فرانس" لکھا ہُوا تھا۔ جب ہم لوگوں نے املا شروع کیا تو خاموشی کی وجہ سے کاپی پر صرف ہمارے قلم چلنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی یا پھر سرجان کی آواز جو ہمیں املا کروا رہے تھے۔ باہر باغ میں کبوتروں کی غٹرغوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں سوچنے لگا کیا اب یہ کبوتر بھی جرمن زبان میں غٹرغوں کیا کریں گے۔

املا کے بعد انھوں نے ہم سے کاپیاں لے لیں پھر انھوں نے تمام لڑکوں پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ مجھے لگا جیسے وہ ہم لوگوں سے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ اسی لمحے چرچ کے گھنٹے نے بجنا شروع کر دیا۔ تو گویا بارہ بج گئے۔ میں نے سوچا۔ سرجان چند لمحے کھڑے ہو کر ہم لوگوں کو دیکھتے رہے۔ پھر اپنی میز سے انہوں نے چاک کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر بلیک بورڈ پر لکھنا شروع کیا۔ "فرانسیسی زبان زندہ باد۔"

وہ کچھ دیر بلیک بورڈ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے لکھے ہوئے الفاظ دیکھتے رہے۔ پھر بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئے۔

[1] مرکزی خیال ماخوذ

ایک سچّا واقعہ

راوی:۔ سید ابُو احمد عاکف

گذشتہ دنوں ابوظہبی میں ایک امریکی کمپنی "وسٹرن پٹرولیم" نے اپنے ملازمین کے لیے ایک نوٹس جاری کیا جس میں تمام ملازمین کو سختی سے متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ دفتر کے اوقات میں کسی قسم کی مذہبی سرگرمی میں حصّہ نہیں لے سکتے۔ اس نوٹس کی رُو سے دفتر کا کام چھوڑ کر نماز کے لیے جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ البتہ نمازیوں کے لیے یہ سہولت تھی کہ وہ چاہیں تو اپنی تنخواہ سے نماز کے لیے صَرف ہونے والے مخصوص وقت کے عوض رقم کٹوا کر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اس نوٹس کے آنے پر خوب واویلا ہُوا، لیکن انتظامیہ نے کسی اعتراض پر خود نہ کیا۔ بہت سے لوگوں نے تو محض اس لیے نماز پڑھنا چھوڑ دی کہ کون اپنی تنخواہ سے پیسے کٹوائے، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے تنخواہ کٹوانا پسند کی، لیکن نماز پڑھنا نہیں چھوڑی۔۔۔ کچھ عرصے کے بعد انتظامیہ نے ایسے لوگوں کی فہرست طلب کی جو تنخواہ سے پیسے کٹنے کے باوجود باقاعدگی سے نماز پڑھتے رہے تھے۔ فہرست مکمّل ہونے پر باقاعدگی سے نماز پڑھنے والوں کو انعام کے طور سے خصوصی بونس دیے گئے۔ تنخواہ سے کٹوتی کی شرط ختم کر دی گئی اور انھیں نماز کے وقت دفتر چھوڑ کر جانے کی اجازت بھی دے دی گئی، جبکہ وہ لوگ جنہوں نے پیسے کٹنے کے خوف سے نماز چھوڑ دی تھی، اُن پر یہ پابندی برقرار رہی۔

یوں گذاری ہیں چھٹیاں میں نے

مقابلۂ مضمون نویسی میں دوسرا انعام حاصل کرنے والا خوبصورت مضمون۔

پرنس وسیم بن اشرف ، میاں چنوں

جب انسان لگے بندھے پروگرام کے مطابق مسلسل کام کرتے کرتے اُکتا جاتا ہے تو اُسے فرصت اور فراغت کے لمحات کی تلاش ہوتی ہے۔ طلبہ بھی جب کئی کئی ماہ تک مسلسل پڑھائی کرنے میں لگے رہتے ہیں تو اُن کی طبیعت میں اُکتاہٹ اور تکان سی پیدا ہو جاتی ہے' اور انہیں تازہ دم ہونے کے لیے روزمرہ کے معمولات میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایسی تبدیلی جس میں دماغی کام کم اور تفریحِ طبع کا سامان زیادہ ہو۔

طلبہ کے لیے سال میں تفریح کا صرف ایک ہی موقع آتا ہے اور یہ موقع ہے سال کے اختتام پر چھٹیوں کا۔ اس سال جب اسکول میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے تین ماہ کی چھٹیوں کا اعلان کیا تو میں نے اکتاہٹ اور بوریت کی کیفیت کو دل و دماغ سے فرار ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ میرے ساتھ ساتھ دیگر طلبہ نے بھی تالیوں کی گونج میں ہیڈ ماسٹر صاحب کی فراہم کردہ اطلاع کا خیر مقدم کیا۔ چار جون تک اساتذۂ کرام نے ہمیں چھٹیوں کا کام دے دیا۔ چار جون کو بارہ بجے اسکول کا گھنٹہ بجا تو ہم نے تین ماہ کے لیے اسکول کے در و دیوار کو خدا حافظ کہا۔ حسبِ اعلان پانچ جون کو ہماری پہلی چھٹی تھی۔

میں شہر کی تنگ و تاریک فضا سے تنگ آچکا تھا اس لیے اس دفعہ میرا پروگرام یہ تھا کہ چھٹیوں کے کچھ دن شہر کے شور و شغب سے دور دیہات کی کھلی فضا میں گزارے جائیں۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک دیہاتی دوست کو خط لکھا کہ میں چھٹیوں کا کام ختم کرنے کے بعد تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔ میرے دوست کو میرا خط پا کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے فوراً جواب میں لکھا: "میں تمہارا منتظر ہوں، جلد آؤ اور آنے سے پہلے اپنی تاریخ آمد سے بھی مطلع کرو میں تمہیں لینے کے لیے پہنچ جاؤں گا' یہ بھی بتانا کہ کس ذریعہ سے آؤ گے؟" چنانچہ جوں ہی میرا اسکول کا کام ختم ہوا میں نے رختِ سفر باندھا اور مقررہ تاریخ کو اپنے دوست کے ہاں پہنچ گیا۔ میرا یہ دوست چکوال کے قریب ایک گاؤں

میں رہائش پذیر ہے۔ میرے دوست اور اُس کے گھر کے دیگر افراد بڑی محبت اور تپاک سے ملے، ان کے خلوص نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں بہت جلد اُن میں گھُل مِل گیا۔ گاؤں کی فضا بڑی خوشگوار تھی۔ گاؤں کے اِرد گِرد موجود پہاڑیوں نے گاؤں کے موسم اور اس کی فطری دلکشی میں اضافہ کیا ہُوا تھا۔ میرے دوست کے والد کا اس گاؤں میں خاصا بڑا زرعی رقبہ ہے۔ اس لیے انہوں نے اُسے سیراب کرنے کے لیے ایک ٹیوب ویل لگایا ہُوا ہے۔ ہم روزانہ صبح کی اذان کے ہوتے ہی اُٹھتے اور ٹیوب ویل پر جا کر خوب نہاتے، "ٹیوب ویل پر نہانا مجھے بہت ہی بھاتا"۔ نہانے کے بعد ہم سیدھے قریب کی مسجد میں چلے جاتے اور نمازِ فجر وہیں ادا کرتے اور پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں پر سے ہوتے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں کی سیر کو نکل جاتے۔ صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں کھیتوں کی ہریالی کا منظر دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سُرور پیدا ہوتا تھا۔ اس کھلی اور خاموش فضا میں خوش نوا پرندوں کی میٹھی میٹھی بولیاں سُن کر اور کسانوں کو کھیتوں میں ہل چلاتے دیکھ کر مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ چونکہ یہ برسات کا موسم تھا اس لیے بعض اوقات ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مغرب کی طرف سے کالی گھٹا اُٹھتی اور آناً فاناً آسمان پر چھا جاتی۔ پہلے ہلکی ہلکی بوندا باندی ہوتی پھر موسلا دھار مینہ برسنے لگتا اور ہر طرف جل تھل ہو جاتا۔ ہمارا معمول تھا کہ دوپہر کا وقت عام طور پر درختوں کے ٹھنڈے سائے میں گزارتے اور دوپہر کا کھانا وہیں کھاتے، کھانے میں مکھن اور لسّی کا خاص طور پر اہتمام ہوتا تھا۔ لسّی کے ساتھ بیسنی روٹی بڑا مزہ دیتی تھی۔ صبح کے ناشتے میں آم کے اچار کے ساتھ دیسی گھی میں پکے ہوئے پراٹھوں کا لطف آج بھی یاد آتا ہے تو منہ میں پانی بھر جاتا ہے۔

میں نے شہر کی زندگی میں چاند طلوع ہونے کا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد جب ہم چہل قدمی کے لیے باہر کھیتوں کی طرف نکلتے تو اُفق پر چاند طلوع ہونے کا حسین منظر دیکھتے۔ نور کا ایک غبارہ نقرئی کرنیں بکھیرتا ہوا دھیرے دھیرے اُوپر اُٹھتا اور فضا میں ایک روپہلی چادر سی تن جاتی۔

دیہات کی کھلی فضا میں سورج کے طلوع و غروب ہونے کا منظر بھی ایک عجیب کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ میں نے اس دلکش منظر کا بار بار نظارہ کیا اور لُطف اُٹھایا۔ میرے دوست کے مکان کی چھت پر سے تاروں بھری رات کا منظر دیکھ کر تو میں دیوانہ ہو جاتا تھا۔ شہر کے آسمان پر تو گرد و غبار کے اتنے بادل ہوتے ہیں کہ تارے بیچارے نظر نہیں آتے۔ تقریباً ایک مہینہ گاؤں کی کھلی فضا میں گزارنے کے بعد مجھے گاؤں والوں کی سادہ زندگی اور کھیتوں کی کھلی

اور لطیف فضا سے اس قدر اُنس ہو گیا تھا کہ اب میرا دل شہر کی گھٹی گھٹی کثیف اور ہنگامہ پرور فضا کے تصور سے گھبرانے لگا تھا۔۔۔

چھٹیاں ختم ہونے میں ابھی کچھ روز باقی تھے۔ چنانچہ میں نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر اسلام آباد گھومنے کا پروگرام بنایا۔ میرے دوست کے چچا نے اسلام آباد گھومنے کے لیے، مجھے اپنی جیپ دے دی اور ہم ضروری سامان لے کر اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ تقریباً تین گھنٹے سفر کے بعد ہم راولپنڈی پہنچ گئے۔ راولپنڈی میں ہم تقریباً دو گھنٹے اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ جیپ اپنی تھی اس لیے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ راولپنڈی میں ہمیں صدر روڈ کا علاقہ سب سے زیادہ پسند آیا تھا۔

دوپہر کو ہم نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل سے کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اسلام آباد کی جانب روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنے دوست سے کہا ہم سب سے پہلے شکر پڑیاں چلیں گے۔ اس نے بتایا کہ وہاں رات کو زیادہ رونق ہوتی ہے اس لیے پہلے ہم فیصل مسجد، زیرو پوائنٹ اور کوہِ دامن کی سیر کو نکل پڑے۔ اسلام آباد کی صاف ستھری اور خوبصورت شاہراہیں دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور دل نے کہا "کاش ہمارا پورا ملک اسی طرح صاف ستھرا اور خوبصورت ہو جائے"۔ زیرو پوائنٹ کا خوبصورت علاقہ دیکھ کر ہم عظیم الشان مسجد فیصل مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ جب ہم فیصل مسجد کے قریب پہنچے تو دن ڈھلنے کے قریب تھا۔ فیصل مسجد کی خوبصورتی دیکھنے کے قابل تھی۔ میں نے اتنی بڑی اور خوبصورت مسجد اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ خوبصورت سنگِ مرمر کی دیواریں، دلکش ڈیزائن، اونچے اونچے مینار، ایک ایک چیز صناعی کا شاہکار تھی۔

ہم تقریباً دو گھنٹے تک مسجد کی سیر کرتے رہے۔ عصر اور مغرب کی نمازیں ہم نے وہیں ادا کیں۔ اور تقریباً رات کے آٹھ بجے ہم واپس ہوئے۔ رات کا کھانا ہم نے کراچی کمپنی کے نزدیک ایک ہوٹل سے کھایا۔ اور پھر شکر پڑیاں کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو رات کے دس بج چکے تھے۔ اتنی خوبصورت پہاڑی دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہم نے وہاں مختلف ملکوں کے سربراہوں کے ہاتھوں سے لگے ہوئے ڈھیر سارے پودے بھی دیکھے۔ اس پہاڑی پر سے راولپنڈی اور اسلام آباد کا منظر بہت ہی سہانا لگ رہا تھا۔ ہم اس پہاڑی کی سیر میں اتنے کھو گئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ جب واپس ہوئے تو ایک بج رہا تھا۔ اس لیے ہم سیدھے اپنی رہائش گاہ پر پہنچے اگلی صبح ہماری منزل دامنِ کوہ، مرگلہ کے پہاڑی سلسلے فوک آرٹ اور ثقافتی ورثے کا قومی ادارہ اور ادارہ

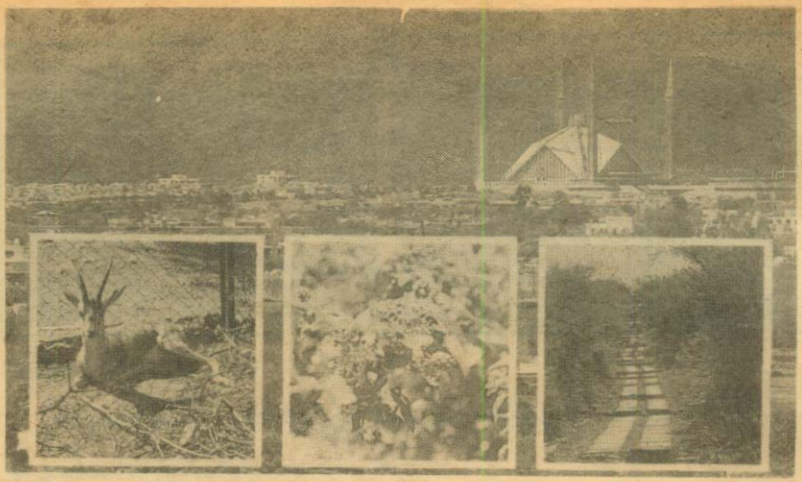

ثقافتِ پاکستان کی آرٹ گیلری تھی۔

سب سے پہلے ہم دامنِ کوہ کی طرف چل پڑے۔ ڈرائیور انتہائی احتیاط سے جیپ چلا رہا تھا۔ کیونکہ بلندی شروع ہو چکی تھی۔

گاڑی اتنی بلندی پر پہنچ چکی تھی کہ ہم نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کیونکہ ایک طرف تو اتنی بڑی کھائیاں تھیں کہ ان کو دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ دوسری طرف انتہائی بلندی پر جاتا ہُوا پہاڑی سلسلہ تھا۔ ڈرائیور تجربے کار تھا اس لیے وہ ہمیں بخیریت چوٹی تک لے گیا۔ چوٹی پر پہنچ کر ہم نے _____ کو لڈ ڈرنک پیئے۔ اور پھر اسلام آباد شہر کا نظارہ کرنے لگے۔ پہاڑ پر سے شہر عجیب نظارہ پیش کر رہا تھا۔ ہم تقریباً دوپہر تک لُطف اندوز ہوتے رہے۔

دوپہر کو ہماری واپسی ہوئی۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ہوٹل ہی سے کھایا اور پھر آرٹ گیلری اور ثقافتی ورثے کا قومی ادارہ دیکھنے چل پڑے۔ آرٹ گیلری میں موجود تصاویر دیکھ کر لگا کہ مصوروں نے اِدھر اُدھر بکھری ہوئی خوبصورتی اور زندہ حقیقتوں کو رنگوں میں ڈھال کر عمارت میں قید کر دیا ہے، پھر ہم ثقافتی ورثے کا قومی ادارہ دیکھا اور تقریباً شام کے چار بجے ہم واپس ہوئے، اسلام آباد کو خیر باد کہا، لیکن اس شہر کی رنگینیاں میرے اندر ایسے جذب ہو کر رہ گئی ہیں کہ شاید ہی میں اس خوبصورت شہر کو بھلا سکوں۔ عشار کے وقت ہم اپنے گاؤں پہنچ چکے تھے۔ رات ہم نے انتہائی سکون کے ساتھ گزاری۔ اگلی صبح میں نے اپنے دوست اور اُن کے گھر والوں سے اجازت لی اور واپس ہو لیا، اپنے شہر پہنچنے تک سارا رستہ میں اُن خوبصورت مناظر اور دلکش رنگینیوں میں ہی کھویا رہا۔ جو میں نے وہاں دیکھی تھیں، میرے دل میں بار بار یہ خیال چٹکیاں لیتا رہا کہ کتنے خوش قسمت انسان ہیں جو

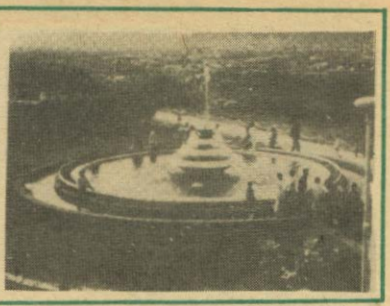

ان خوبصورت علاقوں میں رہتے ہیں۔

میں اپنے شہر تک بخیر و عافیت پہنچ گیا۔ میں نے اپنے دوست کے یہاں تقریباً ڈیڑھ ماہ گزارا تھا، مگر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کل گیا تھا اور آج آ گیا ہوں۔

ان چھٹیوں میں میں جتنا لطف اندوز ہوا تھا اتنا شاید میں کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ اب اس بات کو ایک ماہ گزر گیا ہے مگر میرے دل میں ان جگہوں کی یادیں آج بھی پہلے دن کی طرح تازہ ہیں۔

لوگ کہتے ہیں دُنیا بہت خوبصورت ہے، مگر میرا خیال ہے کہ ہمارا پیارا وطن پاکستان پوری دنیا سے زیادہ خوبصورت ہے۔

گزشتہ ماہ "یوں گزاری ہیں چھٹیاں میں نے" کے سلسلے میں جس مضمون کو اوّل انعام کا مستحق قرار دے کر شائع کیا گیا تھا۔ اس کی مصنفہ تحسین فاطمہ کا تعلق لاہور سے نہیں بلکہ جھنگ صدر سے ہے۔ اس غلطی پر ادارہ تحسین فاطمہ اور اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہے

ادارہ

● کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کرتا جب تک انسان خود جدوجہد نہ کرے عقل مند اور سمجھ دار انسان وہ ہے جس کا آج اس کی گزشتہ کل سے بہتر ہے

● پہاڑ سے گرے ہوتے انسان پھر بھی اٹھ جاتے ہیں مگر دل و نظر سے گر جائیں تو کبھی نہیں اٹھ سکتے۔

حق اسکواڈ ● ڈاک بابو ● اخلاق احمد

فضل دین ڈاکیے کے بارے میں پہلی اطلاع ضیاء نے دی تھی۔

اس روز وہ چاروں اپنے "ہیڈ کوارٹر" میں اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ششماہی امتحانات کا نتیجہ آچکا تھا اور وہ چاروں ... شہزاد، ضیاء، سرفراز اور شہریار ... شاندار نمبروں کے ساتھ پاس ہو چکے تھے۔

ضیاء نے کہا "بھئی آج عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔"

سرفراز ہنسا "واقعہ عجیب تو ہو سکتا ہے، مگر یہ واقعہ غریب کس طرح ہو گیا۔؟"

شہزاد بولا "واقعہ تو سُن لو۔ پہلے ہی ٹانگ اَڑا دیتے ہو۔"

شہریار نے کہا "سناؤ بھائی ضیاء۔ اپنا عجیب و غریب واقعہ سُناؤ۔"

ضیاء نے غصّے سے ان تینوں کو دیکھا اور کہا "... آج صبح میں حسبِ معمول تیز دوڑنے کی مشق کر رہا تھا۔ بستی کے باہر والے پارک کے اٹھارہ چکّر لگانے کے بعد میں آہستہ آہستہ بھاگتا گھر کی طرف جا رہا تھا کہ میری نظر فضل دین پر پڑی۔"

"کون فضل دین ...؟" شہزاد نے پوچھا۔

"بھئی وہی فضل دین ڈاکیہ ... جو ہمارے علاقے میں ڈاک وغیرہ تقسیم کرتا ہے۔ خط لاتا ہے اور منی آرڈر بانٹتا ہے۔ وہ اپنی سائیکل چلاتا جا رہا تھا۔ میں اُس کی سائیکل سے کچھ پیچھے بھاگتا آ رہا تھا۔ ایک جگہ فضل دین نے

عجیب حرکت کی۔ اس نے ایک تھیلا ایک مکان کے اندر پھینک دیا۔"

ایک لمحے کے لیے سب خاموش بیٹھے رہے۔ پھر شہریار نے کہا: "تھیلا مکان کے اندر پھینک دیا...؟"

"ہاں..." ضیا نے پُرجوش لہجے میں کہا... "دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مکان کے دروازے پر تالا لگا ہُوا تھا۔ میں تو کچھ دیر وہاں کھڑا اپنی آنکھیں مسلتا رہا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی ڈاکیہ ایک تھیلا اُچھالے اور کسی بند گھر میں پھینک دے۔ ڈاکیے تو اگر پارسل وغیرہ لے کر آتے ہیں تو دروازہ کھٹکھٹا کر کسی کو بلاتے ہیں، پارسل اُس کے حوالے کرتے ہیں اور رسید پر دستخط کرواتے ہیں۔ یوں تھیلا اُچھال کر نہیں پھینکتے۔ پھر وہ مکان تو بند پڑا تھا۔ دروازے پر اتنا موٹا تالا لٹک رہا تھا۔ وہاں کوئی پارسل یا کوئی دوسری چیز پھینکنے کا کیا مطلب ہے؟"

سب حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

پھر شہریار نے آہستہ سے کہا... "مجھے لگتا ہے کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔"

اگلے روز حق اسکواڈ میدانِ عمل میں آ چکا تھا۔

ہر روز کی طرح اس دن بھی فضل دین ڈاکیہ صبح آٹھ بجے کے قریب ڈاکخانے سے نکلا۔ اس کی سائیکل کے پیچھے تین چار تھیلے بندھے ہوئے تھے۔ ایک تھیلا ہینڈل کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ ان تھیلوں میں خط بھی تھے، پارسل بھی تھے۔ اور مختلف رسالے وغیرہ بھی تھے۔ یہ سب چیزیں مختلف گھروں تک پہنچانا ہی فضل دین کی ذمہ داری تھی۔

آج بھی وہ مختلف گھروں پر رُک کر ڈاک بانٹتا گیا۔ وہ کئی برس سے یہی کام کر رہا تھا۔ علاقے کے سبھی لوگ اُسے اچھی طرح جانتے تھے۔

وہ یونہی سائیکل کے ذریعے علاقے میں گھومتا رہا، خطوط بانٹتا رہا۔ منی آرڈر تقسیم کرتا رہا۔ رجسٹریاں پہنچاتا رہا۔

لیکن پھر ایک گلی کے ایک خاص مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ایک تھیلا اچانک اس گھر میں اُچھال دیا۔ گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔

اردگرد کوئی نہیں تھا۔ کسی نے اُسے تھیلا اُچھال کر گھر میں پھینکتے نہیں دیکھا۔ کم از کم فضل دین ڈاکیے کا یہی خیال تھا۔

لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔

چار نوعمر لڑکوں نے اُسے تھیلا اُچھال کر اس گھر میں پھینکتے دیکھ لیا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکا کچھ دُور ایک درخت پر چڑھا ہوا تھا۔ ایک گلی ہی کے ایک مکان کی چھت پر بیٹھا تھا۔ ایک لڑکا گلی میں بچھی چارپائی کے نیچے چھپا بیٹھا تھا۔ ایک لڑکا گلی ہی کے ایک دروازے پر لٹکتے پردے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔

فضل دین سائیکل چلاتا گلی سے گزر گیا تو وہ چاروں اپنی خفیہ پناہ گاہوں سے نکل کر گلی میں آ گئے۔

"دیکھا بھائی" ضیا نے کہا۔

"ہاں" سرفراز نے کہا۔۔۔ "لیکن ہمیں یہاں گلی کے بیچ میں کھڑے ہو کر اس مسئلے پر غور نہیں کرنا چاہیئے۔ غور کرنے اور فیصلہ کرنے کے لیے ہم نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا ہے"

وہ چاروں تیزی سے اس غار کی طرف روانہ ہو گئے جہاں حق اسکواڈ فیصلے کرتا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ چاروں مختلف کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ایک نے پانی گرم رکھا دوسرے نے چائے بنائی، تیسرے نے چائے مگ میں ڈال کر سب کے سامنے رکھ دی۔ چوتھے نے کچھ نہیں کیا کیونکہ اسے برتن صاف کرنے تھے۔

گرم گرم چائے پیتے ہوئے شہریار نے کہا۔۔۔ "میں نے سوچ لیا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے"

"اور کیا فیصلہ کیا ہے حضور نے؟" سرفراز نے سر ہلا کر پوچھا۔

"سب سے پہلے ہمیں فضل دین کے بارے میں معلوم کرنا ہوگا۔ وہ کہاں رہتا ہے؟ اور کیسی زندگی گزارتا ہے؟"

"سبحان اللہ" سرفراز نے پھر احمقوں کی طرح سر ہلایا۔ "کیا عمدہ سوالات ہیں حضور کے پاس۔ ارے بھائی۔ فضل دین ویسے ہی زندگی گزارتا ہے جیسے سب گزارتے ہیں۔ صبح اُٹھتا ہے۔ ناشتہ کرتا ہے۔ دفتر جاتا ہے۔ پھر ....."

"میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں" شہریار نے کہا۔ "ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کہیں عیش و عشرت کی زندگی تو نہیں گزار رہا ہے۔ مجھے شبہ ہے .... کوئی نہ کوئی لمبی گڑبڑ ہے"

"ٹھیک ہے" ضیا نے کہا۔ "کل میں اور شہزاد جا کر اس کا گھر دیکھ کر آتے ہیں۔ معلوم کر لیتے ہیں کہ وہ کیسی زندگی گزار رہا ہے"

"یہ کام تم لوگ کر لو تو باقی کام میں اور سرفراز کر لیں گے" شہریار مسکرایا۔

وہ تینوں حیرت سے اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

اگلی صبح شہریار اور سرفراز اسی گلی میں دوبارہ جا پہنچے۔ جس مکان میں فضل دین ڈاکیے نے تھیلا پھینکا تھا وہاں اب بھی تالا لگا ہوا تھا۔

شہریار اور سرفراز گلی کے آخری سرے تک جا پہنچے جہاں ایک دودھ والے کی دکان تھی۔

"پاؤ پاؤ دودھ پلاؤ استاد ..." سرفراز نے کہا "ملائی والا"

دُودھ والے نے مسکرا کر انھیں سامنے پڑی بینچوں پر بیٹھنے کو کہا اور ذرا سی دیر میں دو پیالے ان کی طرف بڑھا دیے۔

دُودھ پیتے ہوئے شہریار نے کہا۔ "اُستاد، تمھارے محلے میں کوئی کرائے کا مکان خالی نہیں ہے؟"

"کرائے کا مکان ...؟" دُودھ والے نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نہیں باؤ جی، ہمارے محلے میں تو شاید نہیں ہے ..."

سرفراز نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر کہا "وہ جس مکان پر تالا لٹک رہا ہے۔ وہ تو ہمیشہ بند ہی رہتا ہے۔ وہ بھی کرائے پر نہیں چل سکتا...؟"

"نہیں جی..." دُودھ والا ہنسا..." وہاں تو ایک بوڑھا رہتا ہے، شام کو کہیں سے آتا ہے اور رات کے ٹائم کہیں چلا جاتا ہے۔ بڑا شریف اور اللہ لوک لگتا ہے۔"

سرفراز اور شہریار نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

پھر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اب صرف ضیا اور شہزاد کی رپورٹ کا انتظار تھا۔ وہ سیدھے اپنے ہیڈکوارٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔

گیارہ بجے کے قریب شہزاد اور ضیا بھی آ گئے۔

"کمال ہے بھائی..." شہزاد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "فضل دین تو ایک کوٹھی میں رہتا ہے۔ کئی نوکر چاکر کام کرتے ہیں اس کے پاس۔ علاقے میں یہ بات مشہور ہے کہ اس کے کسی پرائز بانڈ پر ایک لاکھ روپے کا انعام نکل آیا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ ایسی عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگا ہے۔"

"ویری گڈ..." شہریار نے چٹکی بجا کر کہا "شہزاد... تمہارا کیمرہ کہاں ہے...؟"

شہزاد اُٹھا اور ایک کونے سے کیمرہ اُٹھا لایا۔

شہریار نے کہا "ہم کل رات کو کارروائی کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں بہت سے کام کرنے ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم تینوں اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

اس کے بعد شہریار انہیں سمجھاتا رہا۔

اور وہ حیرت سے اُسے دیکھتے رہے، اس کی باتیں سنتے رہے۔

اگلی شام کو وہ اندھیرا پھیلنے سے کچھ پہلے ہیڈکوارٹر سے روانہ ہوئے۔

کچھ دیر بعد جب وہ اسی گلی میں پہنچے تو انہوں نے توقع کے مطابق مکان کے دروازے پر تالا نہیں پایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

سرفراز نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے...؟" اندر سے کسی نے کرخت آواز میں پوچھا۔

"کھولیے بابا جی..." شہریار نے کہا۔

چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور سفید بالوں، سفید داڑھی والے ایک بوڑھے نے پوچھا..." کیا بات ہے؟"

"سبیل کا چندہ بابا جی..." سرفراز نے کہا۔

"سبیل کا چندہ...؟" بوڑھے نے حیرت سے کہا "کیسی سبیل...؟"

"کمال ہے بابا جی..." ضیا نے کہا "آپ کو نہیں پتا... سبیل جو ہوتی ہے۔ بھٹی جہاں پانی پلاتے ہیں آنے جانے والوں کو۔"

بوڑھے نے غصّے سے کہا "مگر وہ تو محرم کے مہینے میں بنائی جاتی ہیں۔ محرم تو گزر چکا ہے۔ تم لوگ اب سبیل بنانے چلے ہو۔"

"تو کیا ہوا بابا جی... کیا آج کل سبیل بنانے پر پابندی ہے؟" شہزاد نے پوچھا۔

"اچھا اچھا۔ بحث نہیں کرو۔" بوڑھے نے کہا اور جیب سے چار آنے نکال کر ان کو دیے۔

شہریار نے چونی کو یوں دیکھا جیسے کسی خطرناک ٹائم بم کو دیکھ رہا ہو۔ پھر وہ بولا "یہ کیا ہے بابا جی...؟"

"چار آنے ہیں اور کیا ہے...؟" بوڑھے نے کہا "بس یہی ہیں میرے پاس۔ میں اور نہیں دے سکتا۔"

اسی وقت شہریار نے سرفراز کو دیکھا۔

سرفراز مسکرایا۔ کارروائی کا وقت آگیا تھا۔

سرفراز جھکا اور بوڑھے کے قدموں سے لپٹ گیا۔ "بابا جی۔ خدا کے لیے... اللہ کے واسطے بابا جی۔ ہمیں اور پیسے دو... میں تمہاری منت کرتا ہوں بابا جی..."

بوڑھا اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے بوکھلا کر کہا "ابے۔ میرے پیر تو چھوڑ۔ چھوڑ دے۔ یہ کیا کر رہا ہے... اچھا یار... ایک روپیہ لے لے..."

اسی وقت شہریار اچھل کر بوڑھے کی گردن سے لپٹ گیا۔ "بابا جی... ایک روپیہ نہیں... دس روپے لیں گے... خدا کے لیے بابا جی..."

بوڑھے کے پیر سرفراز نے پکڑ رکھے تھے۔ شہریار اچھل کر اس کی گردن سے لپٹا تو بوڑھا لڑکھڑایا "اوئے۔ چھوڑو مجھے" اس نے چلّا کر کہا۔

مگر اس وقت شہزاد اور ضیا اس کے کندھوں پر لٹک گئے۔ "بابا جی..." وہ چلّائے "اللہ کے نام پر... سبیل کے لیے... دس روپے دے دو..."

اس نئی افتاد کے نازل ہونے پر بوڑھا لڑکھڑایا اور وہ تمام لوگ فرش پر ڈھیر ہو گئے۔

فرش سے اُٹھتے ہی سرفراز نے حیرت سے کہا "ارے۔ بابا جی کی داڑھی کو کیا ہوا؟ یہ تو اپنی جگہ سے ہل گئی ہے۔ لگتا ہے یہ گرنے سے ہوا ہے۔"

"ہاں۔" ضیاء بولا "اور سر کے سفید بالوں کے نیچے سے کالے بال بھی تو نظر آنے لگے ہیں۔"

شہریار بولا "عجیب بات یہ ہے کہ بابا جی کی شکل فضل دین ڈاکیے سے بہت ملنے لگی ہے۔"

"ملنے کیا لگی ہے۔" شہزاد بولا "یہ تو ہے ہی فضل دین ڈاکیہ۔"

فضل دین اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

چاروں لڑکوں نے حیرت سے وہ چمکتا ہُوا چاقو دیکھا جو اب اُس کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔ "کون ہو تم لوگ...؟" اس نے پوچھا۔ "کیا چاہتے ہو...؟"

"تمہارا کھیل ختم ہوگیا ہے فضل دین" شہریار نے کہا۔ "تم ایک ڈاکیے ہو لیکن کوٹھی میں رہتے ہو۔ دن میں ڈاک بانٹتے ہو مگر گھر پر نوکر چاکر کام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حرام کی آمدنی سے ہی ہو رہا ہے، لیکن حرام کی آمدنی کبھی ساتھ نہیں دیتی فضل دین..... پریشانی میں یہ ہمیشہ ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔"

فضل دین مسکرایا۔ "جیسے تمہاری عقل تمہارا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔" اس نے اچانک شہریار پر حملہ کر دیا۔

شہریار نے چاقو کا چمکتا پھل اپنی طرف آتے دیکھا۔

اسی وقت وہ بجلی کی طرح گھوما اور اُس کی لات فضل دین کے جبڑے پر پڑی۔ فضل دین اُلٹ کر پیچھے جا گرا۔ وہ پھر اُٹھا مگر اس کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہی سرفراز پیچھے سے اس کی ٹانگوں میں گھس کر ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ فضل دین ہوا میں یوں بلند ہوا جیسے وہ کوئی چھوٹا سا کھلونا ہو۔ وہ زمین پر گر کر سنبھلا بھی نہیں تھا کہ شہریار کا کراٹے والا ہاتھ اس کی کنپٹی پر پڑا۔ لمحہ بھر کے لیے فضل دین کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔

جب اُسے ہوش آیا تو کھلے ہوئے دروازے سے اُس نے ڈاک خانے کے پوسٹ ماسٹر کو اندر آتے دیکھا۔ اس کا رنگ اُڑ گیا۔ اُن کے پیچھے ایک پولیس انسپکٹر اور دو سپاہی بھی تھے۔

فضل دین نے اپنی سفید داڑھی اور سفید بال اُتار دیے اور مجرموں کی طرح خاموش کھڑا ہوگیا۔

شہریار نے کہا۔ "فضل دین کا منصوبہ بہت اچھا تھا پوسٹ ماسٹر صاحب۔ وہ ہر روز چند نئے قیمتی رسالے، ایک دو قیمتی پارسل، دو چار سو روپے کا کوئی منی آرڈر غائب کر دیتا تھا۔ رقم، رسالے اور قیمتی چیزیں وہ ایک تھیلے میں بند کر کے اس گھر میں پھینک دیتا تھا۔ یہ گھر اُس نے خود ہی کرائے پر لے رکھا تھا۔ ہر شام وہ بوڑھا بن کر آتا تھا اور یہ چیزیں سمیٹ کر رات کو چلا جاتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہاں کوئی بزرگ آدمی رہتا ہے۔ اگر آپ لوگ تلاشی لیں تو آپ کو یہیں پر وہ تھیلا مل جائے گا جو اس نے آج صبح ہی اُچھال کر اندر پھینکا تھا۔ بظاہر یہ چھوٹی سی چوری لگتی ہے، لیکن ہر روز پانچ چھ سو روپے کی گڑبڑ کا مطلب ہوتا ہے مہینے میں ہزاروں روپے کا فائدہ۔ اپنی ہزاروں روپوں کی مدد سے فضل دین نے کوٹھی بنالی تھی۔ اور عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا تھا۔

جب فضل دین کو ہتھکڑیاں پہنائی جا رہی تھیں، پوسٹ ماسٹر صاحب لڑکوں کے پاس آئے اور بولے۔ "بھئی میں تمہارے حق اسکواڈ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ خدا تم لوگوں کی ہمتیں جواں رکھے۔"

اس روز گھر جاتے ہوئے وہ چاروں بہت خوش تھے۔

راستے میں اچانک سرفراز نے کہا۔ "ارے ایک بات تو بھول ہی گئے۔"

"کیا...؟" ضیا نے پوچھا۔ سرفراز نے پوری قوت سے نعرہ لگایا۔ "حق اسکواڈ!"

"زندہ باد!" ان تینوں نے پوری قوت سے جواب دیا۔ ان کی آوازیں دُور تک گونجتی چلی گئیں۔

ہائے ہماری ہاکی ٹیم

محمد امان خان دل

غم بے شمار لے کر ہاکی کی ٹیم آئی صدمے ہزار لے کر ہاکی کی ٹیم آئی

چھپن کے بعد ایسا پہلی دفعہ ہُوا ہے
ہاکی میں کوئی تمغہ ہم کو نہیں ملا ہے
تھا پاس جو ہمارے اعزاز چھن چکا ہے

دل سوگوار لے کر ہاکی کی ٹیم آئی صدمے ہزار لے کر ہاکی کی ٹیم آئی

ایسے مقابلوں کا ان میں شعور کیا ہے
کمسن کھلاڑیوں کا لیکن قصور کیا ہے
شکوہ مگر کسی سے ربِّ غفور کیا ہے

خود انتشار لے کر ہاکی کی ٹیم آئی صدمے ہزار لے کر ہاکی کی ٹیم آئی

لیکن بہادرو تم ہمت نہ ہار دینا
اگلی دفعہ سبھی پر تم گول مار دینا
تم پر جو ہو گئے ہیں قرضے اُتار دینا

کیا غم جو ہار لے کر ہاکی کی ٹیم آئی صدمے ہزار لے کر ہاکی کی ٹیم آئی

انسان تھے یا کہ موم کے پتلے تھے ٹیم میں؟

آپ کی ذہنی عمر کیا ہے

اس کا فیصلہ آپ کے جوابات سے ہوگا۔

۱ آپ کے خیال میں دنیا کا سب سے اہم ترین مسئلہ کیا ہے ؟ _____

۲ آپ اپنے دوست میں کون سی خوبی کو دیکھنا پسند کرتے ہیں ؟ _____

۳ آپ کی رائے میں آپ کے گھر میں کتنے بہن بھائی ہونے چاہئیں ؟ _____

۴ آپ کو اپنے والدین کی کون سی بات سخت ناپسند ہے ؟ _____

۵ وہ کون سی غذا ہے جس کے بغیر آپ زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے ؟ _____

۶ وہ کون سا مسلم ملک ہے جہاں کا دورہ کرنے کی آپ کو شدید خواہش ہے ؟ _____

۷ اگر آپ کو کسی سیاستدان کے خاندان کا رکن بننے کا موقع دیا جائے تو آپ کس سیاستدان کا انتخاب کریں گے ؟ _____

۸ درج ذیل میں سے کس کو آپ سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں ؟

الف : خاندان _____

ب : دوست _____

ج : اساتذہ _____

د : کھیل _____

ج : مذہب _____

۹ درج ذیل میں سے آپ کن غیر نصابی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

الف : ٹیلی وژن دیکھنا

ب : کھیلنا (کرکٹ، فٹ بال، ہاکی یا کوئی بھی کھیل)

ج : وی سی آر دیکھنا

د : دوستوں سے گپ شپ

ذ : موسیقی سُننا

ر : خطوط لکھنا

ز : ٹیلی فون پر باتیں کرنا

س : کہانیوں کی کتابیں پڑھنا

۱۰ گزشتہ سال درج ذیل میں سے کون سا واقعہ آپ کے لیے سب سے خوشگوار تھا۔

الف : امتحان میں شاندار کامیابی۔

ب : ایک نئے دوست سے ملاقات۔

ج : گھر میں بھائی یا بہن کی پیدائش۔

د : پکنک یا کسی نئے شہر کا دورہ

ذ : کسی مقابلے میں کامیابی

ر : کوئی اور واقعہ

نام _____ عمر _____ کلاس _____

پتہ _____

میں نے ہیلن کیلر کو نہیں دیکھا بلکہ شاید اس کی کوئی تصویر بھی نہیں دیکھی اور اگر دیکھی بھی ہوگی تو مجھے یاد نہیں البتہ ہیلن کیلر کی ایک تصویر جو میرے ذہن کے اسکرین پر خود بہ خود بن گئی ہے میں اُسے اکثر دیکھتا رہتا ہوں، یہ بہت حسین تصویر ہے۔ بہت ہی دلکش اور بڑی ہی جاذبِ نظر۔

اس تصویر میں ایک حسین بچی اپنی شفیق اور مہربان استاد مس سولیون کا ہاتھ پکڑے ہوئے فرشتوں کی طرح مسکرا رہی ہے۔ یہ بچی مجھے کبھی پریوں اور کبھی گڑیوں کی طرح معصوم دکھائی دیتی ہے۔ میرے تصوّر کے پردے پر جو چند تصویریں ہر وقت آویزاں رہتی ہیں۔ اس بچی کی تصویر اُن میں سے ایک ہے، یہ بچی آنکھوں کی بینائی سے محروم ہے مگر پھر بھی مجھے اس کی آنکھیں اُن لاکھوں آنکھوں سے اچھی لگتی ہیں جو اپنی ذات سے آگے کا منظر نہیں دیکھ پاتیں۔ یہ لڑکی سُن بھی نہیں سکتی مگر کتنی عجیب بات ہے کہ یہ بہری لڑکی بے بہرہ نہیں ہے، یہ لڑکی بول بھی نہیں سکتی مگر پھر بھی اس کی خاموشی سے دانائی اور حکمت کے جھرنے پھوٹتے ہیں۔

ہیلن کیلر کا نام آپ کے لیے نیا نہیں ہوگا۔ ۱۸۸۰ء میں امریکہ میں پیدا ہونے والی گونگی، بہری اور نابینا بچی آگے چل کر اعلیٰ تعلیم

سُمیرا
آج کی ہیلن کیلر
محمد سلیم مغل

حاصل کرتی ہے، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور کئی زبانوں پر دسترس حاصل کرنے کے بعد نابیناؤں کی تعلیم و تربیت کے لیے دُنیا بھر میں ادارے قائم کر کے دُنیا کو فرطِ حیرت میں ڈال دینے والی ہیلن کیلر کا نام دُنیا بھر میں یونہی تو مشہور نہیں ہو گیا۔ جو لوگ اپنے حوصلے اور عزم سے اپنی مجبوریوں کو شکست دیتے ہیں۔ قُدرت بھی اُن پر مہربان ہوتی ہے اور اُن پر اُن کی کامرانی کے نئے در کھول دیتی ہے۔ ایسے لوگ تعظیم کے قابل ہیں۔ ان کا احترام ہم پر واجب ہے، ان سے محبت کرنا ہمارا فرض ہے ..... یقیناً بڑائی کا معیار یہی ہے ... یہی بڑے لوگ ہیں۔ ہیلن کیلر سے عقیدت کی جو تصویر میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے میں نے نہیں بنایا۔ اسے تو خود ہیلن کیلر نے لاکھوں کروڑوں لوگوں کے ذہنوں پر اپنے کردار اور عمل کے حسین رنگوں سے تخلیق کیا ہے ... یہ ایسی تصویر ہے جس کے رنگ کبھی مدھم نہیں ہوتے، جس کا حُسن کبھی ماند نہیں پڑتا۔

میں نے ہیلن کیلر کی اس خیالی تصویر کا ذکر محض اس لیے کیا کہ میں نے ایک روز ہُو بہُو ایسی ہی ایک لڑکی دیکھی، مجھے بہت عجیب لگا ..... جو تصویر محض میرا واہمہ تھی وہ حقیقت کس طرح ہو سکتی ہے، مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، وہی معصوم مُسکراہٹ، ویسا ہی گڑیوں والا چہرہ ..... ڈھولک کی تھاپ پر گانا گاتی ہوئی بچیوں میں سے وہ ایک تھی مگر سب سے مختلف، سب سے باوقار بڑی بہن کی شادی پر اتنی محبت اور محویت سے گاتے ہوئے وہ بچی مجھے بہت بھلی معلوم ہوئی، میرے عزیز انجم بھائی مجھے اس کے متعلق بتاتے چلے گئے اور پھر ہر نئی بات پر سُمیرا سے باتیں کرنے کا میرا اشتیاق بھی بڑھتا چلا گیا۔ ساجدہ بھابی نے بتایا کہ سُمیرا اُن کی بھانجی ہے۔ سمیرا پیدا ہوئی تو آنکھوں کی بینائی چلی گئی لیکن اس بچی نے اس محرومی کو نہ کبھی مجبوری سمجھا نہ معذوری یہ گھر کی سب سے زیادہ مطمئن بچی ہے، ہر وقت مُسکراتی رہنے والی سمیرا امریکہ میں رہتی ہے، وہیں پلی بڑھی اور اب اپنی بڑی بہن کی شادی کے سلسلے میں سب گھر والوں کے ساتھ پاکستان آئی ہوئی ہے۔

اچھا تو آپ ہیلن کیلر کے دیس سے آئی ہیں، میں نے سُمیرا سے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح کیا۔ میں آپ کو آنکھ مچولی کے قارئین سے ملوانا چاہتا ہوں، مجھے یقین ہے وہ آپ سے مل کر خوش ہوں گے۔

یقیناً مجھے بھی خوشی ہوگی، سمیرا نے بڑی محبت سے جواب دیا۔ شادی والے گھر میں کس قدر گہما گہمی ہوتی ہے اس لیے ہم لوگ سب سے بچ بچا کر ایک ایسے کمرے میں آ بیٹھے جہاں کسی طرح کا ہنگامہ نہ تھا۔ سمیرا کی بڑی بہن فرح جو خود دلہن بننے والی تھیں ہماری گفتگو میں شامل ہو گئیں، انجم بھائی اور گھر کے چند دیگر افراد بھی قریب آ بیٹھے۔ ہم سب سمیرا کو دیکھ رہے تھے۔ اور سُمیرا ہمیں نہ دیکھتے ہوئے بھی اپنے قریب محسوس کر رہی تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن دبا دیا کہ معاً اس کی موجودگی کا احساس سُمیرا کو نہ ہو جائے۔

اچھا بھئی سمیرا سب سے پہلے تو اپنا تعارف خوب اچھی طرح کروا دو۔ سمجھیے اس لیے کہ یہی گفتگو کا فائدہ ہے، سُمیرا نے رُک رُک کر، سوچ سوچ کر اور لمبے لمبے وقفوں کے ساتھ اپنے بارے میں جو کچھ بتایا وہ مختصراً کچھ یوں ہے۔ میرا نام سُمیرا شکیل ہے، میں امریکی ریاست نیو جرسی کے ایک چھوٹے سے شہر لنڈن (LINDEN) میں اپنے امی ابو، تین بہنوں اور

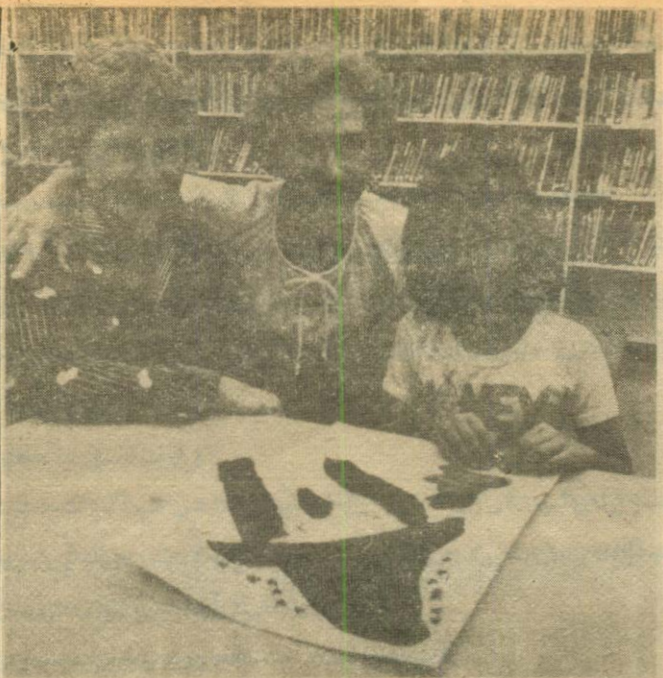

سُمیرا نے
آنکھوں کی
بے نوری کو
کبھی مجبوری
نہیں بننے دیا
امریکی اخبار کا
یہ تراشہ
سُمیرا کی
صلاحیتوں کا
منہ بولتا
ثبوت ہے

A VERY SPECIAL STUDENT—Sumara Shakeel has been visually handicapped since birth, but a visitor to her classes at Linden's School 6 might never know it. The seven-year-old participates in gym and art classes as well as regular classes. Sumara, on right, shares one of her creations from art class with art teacher Shirley Gray, left, and School 6 principal Bernice Bedrick.
(Photo by Frank Taranto)

Lack of sight is not a handicap to one young School 6 student

By MARY BEDNARCZAK

To the casual visitor, it would appear to be the usual class of second graders busily choosing the colors with which to paint their pictures in Shirley Gray's art class at School 6.

There is a difference, however, for one of these active, happy youngsters has just been given a special award for art work—art work which she cannot see.

Sumara Shakeel, 7, has been visually handicapped from birth, but thanks to the work of a group of interested and dedicated teachers, she functions on the same level as the sighted students in her class.

Tactile materials are used for Sumara's art work, such as a special textured paper on which the picture has been outlined by a wheel so she can feel the picture and paint within the outline. Working with magic markers which have different scents, she is able to distinguish colors and, therefore, paint her pictures. Her art teacher has developed the procedures by closing her eyes and working with the materials as if she could not see.

Susan Wallace, a second grade teacher, says Sumara is just like any other child in the room, and functions very well. Using a Braillewriter for her classwork, she does the same work as the others. Assistance in supplemental work is given by Maryanne Arlotta, who also works with Sumara on math and writing assignments.

Four times a week, Mildred Norris from the N.J. Federation of the Blind comes to help Sumara with braille skills. She also administers any district testing, which has to be done in braille. Norris also puts next year's textbooks into braille for Sumara's use.

In gym class, it is difficult to locate this sightless girl. Sumara jumps rope like a pro. She plays ball with a special ball which has a bell inside, so that she can locate it by sound. Physical education teacher Peter O'Halloran has given Sumara special attention so that she is able to be physically active. She has been exposed to a variety of other activities which involve jogging, skipping and use of the hula-hoop.

Sumara is the daughter of Ahmed and Jamilla Shakeel, of Smith Street, Linden. The family came to this country from Pakistan, when Sumara was two years old. Shakeel is employed as a civil engineer. He and his wife have three other children. Son Haris, 16, and daughter Farah, 15, are both students at Soehl Junior High School. A third daughter, Asma, 9, attends School 6 with Sumara. The two sisters come to school together on the bus, but after that Sumara manages on her own. When she started kindergarten at School 6, she needed some assistance to find her way around the school complex, but now is quite at home. She has her own assigned table in the lunchroom and goes straight to it. Her lunch is brought to her. In the playground, she takes part in all the fun and activities, and this year she even goes to the bathroom on the lower level without assistance.

Sumara's progress in school is an example of successful mainstreaming of a handicapped child. Bernice Bedrick, principal of School 6, credits the team approach of her teachers, often giving much of their own time, and the representatives of the N.J. Commission for the Blind with a significant contribution to Sumara's success. "These teachers had no special or previous training with a visually handicapped child," stated Bedrick. "They have evolved their methods and approach as they have worked with her." She went on to say that it was their aim to prepare Sumara for a productive future.

ایک بھائی کے ساتھ رہتی ہوں، میں نے حال ہی میں لنڈن ہائی اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا ہے، میرے ابو آرکیٹیکٹ انجینئر ہیں۔ میں ڈھائی سال کی عمر میں پاکستان سے چلی گئی تھی۔ اُس وقت سے امریکہ ہی میں ہوں، امریکی شہریت رکھتی ہوں، گزشتہ ۱۴ سال میں دوسری مرتبہ پاکستان آئی ہوں۔

وہ تو ٹھیک ہے سمیرا مگر آپ اس قدر رُک رُک کر اور آہستہ آہستہ کیوں بول رہی ہیں۔۔۔ میں نے پوچھا

وہ۔۔۔ وہ دراصل آپ نے ٹیپ جو چلا رکھا ہے اس لیے سوچ سمجھ کر بولنا پڑتا ہے۔۔۔۔ سُمیرا کے جواب نے ہم سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس لیے کہ ہم نے اپنی دانست میں ٹیپ ریکارڈر کو سُمیرا سے چُھپا رکھا تھا۔ تب مجھے احساس ہُوا کہ قدرت جن لوگوں سے ایک حس کو لے لیتی ہے اُس کی دوسری حسوں کو کس قدر بیدار اور طاقت ور کر دیتی ہے۔ میں نے گفتگو کا رُخ بدلنا چاہا تو سمیرا سے فوراً یہ پوچھ لیا کہ

تمہیں پاکستان کیسا لگتا ہے؟

اچھا لگتا ہے بہت اچھا، آپ اس سے اندازہ کیجیے کہ میں امریکی شہریت رکھتی ہوں مگر جب بھی کوئی پوچھتا ہے تو میں یہی کہتی ہوں کہ میں پاکستانی ہوں۔ مجھے پاکستانی ہونے پر فخر ہے۔ نیویارک میں ہر سال پاکستان کا دن منایا جاتا ہے میں اُس میں شریک ہوتی ہوں، جھنڈیاں لے کر جاتی ہوں اور خوش ہوتی ہوں۔

تو پھر آپ پاکستان آ کیوں نہیں جاتیں۔۔۔۔ میں نے مداخلت کی۔

آ تو جائیں مگر ابو کی ملازمت اور یہاں کے لاتعداد مسائل کی وجہ سے آتے ہوئے ڈر لگتا ہے، اب دیکھیے نا یہاں پانی کس قدر گدلا آتا ہے، کبھی کبھار تو بدبو بھی ہوتی ہے اور ذائقہ بھی خراب، بوائل کیے بغیر تو پیا ہی نہیں جا سکتا۔ اسی طرح بجلی بھی آئے دن جاتی رہتی ہے۔۔۔۔

تو کیا بجلی امریکہ میں نہیں جاتی۔۔۔۔؟ میں نے پوچھا

میری عمر کے گزشتہ ۱۴ سالوں میں ایک بار گئی تھی اور وہ جو ایک بار گئی تھی وہ بھی دراصل ۳۰ یا ۴۰ سال میں ایک بار گئی تھی۔ کیا آپ یقین کریں گے؟

ہاں یقین تو کر لوں گا مگر بجلی کے جاتے ہی جو قتل و غارت گری امریکہ میں ہوئی تھی اُسے بھی نہیں بُھول سکتا یہ بات میں نے محض دل میں سوچی اور سُمیرا سے یُوں نہ کہی کہ میں اُسے کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ یُوں بھی میرا مقصد اُس سے بحث کرنا نہیں بلکہ اُس سے باتیں کرنا تھا۔ سو میں نے سر جھٹک کر کہا ہاں سُمیرا۔۔۔۔ واقعی یہ بات ٹھیک ہے، ہمارے اپنے مسائل ہیں اور امریکہ کے اپنے، اچھا یہ بتائیے کہ آپ پاکستان سے محبت کیوں کرتی ہیں؟

اس کی کئی وجوہات ہیں، میں یہاں پیدا ہوئی، یہاں میرے رشتے دار اور عزیز رہتے ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے، یہاں میری طرح کے کلمہ گو اور اللہ کے ماننے والے لوگ رہتے ہیں، پاکستان سے محبت کا یہی تعلق

سب سے بڑا تعلق ہے۔

سُمیرا ... امریکی۔ پتے پاکستان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں ؟

ارے وہ تو جانتے ہی نہیں کہ پاکستان کوئی مُلک بھی ہے، بہت کم بچّوں کو معلوم ہے کہ پاکستان ایک مُلک ہے۔

اچھا اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑیں یہ بتائیں کہ آپ کے مشاغل کیا ہیں۔ آپ کا فارغ وقت اور چھٹیاں کیسے گذرتی ہیں ؟

میں سائیکل چلاتی ہوں، اسکیٹنگ کرتی ہوں، مگر اب اسکیٹنگ کم کر دی ہے، کچھ عرصہ تک سوئمنگ بھی کی، چھٹیوں میں پکنک پر جاتی ہوں، میوزک سے لگاؤ ہے اُس سے بھی دِل بہل جاتا ہے، کبھی کبھار سینما دیکھنے چلی جاتی ہوں۔

سینما دیکھنے .... کیا کہہ رہی ہیں سُمیرا، میں نے حیرت اور استعجاب سے پوچھا۔

ہاں ! میں ڈائیلاگ سُنتی رہتی ہوں، دوست منظر سمجھا دیتی ہیں۔ اس طرح ENJOY کر لیتی ہوں۔

آپ نے مختلف مقابلوں میں بہت سے ایوارڈز بھی تو لیے ہیں کچھ ان کی تفصیل بھی تو بتائیے .... ہم نے ایک امریکی اخبار میں آپ کے متعلق پڑھا تھا۔۔۔

اس سوال کے جواب میں سُمیرا کے بجائے ان کی بہن فرح نے فر فر کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ سُمیرا کو بہترین تعلیمی ایوارڈ مل چکا ہے، ویسے بھی پڑھنے میں اچھی ہیں، اکثر اے اور بی گریڈ آتا ہے، کھیلوں اور میوزک میں بھی کافی انعامات ملے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل نیو جرسی کے تعلیمی اداروں کی ایک تقریب ہوئی تھی جو اسپیشل اولمپک کہلاتی ہے، سُمیرا نے اُس میں بھی حصّہ لیا تھا۔ ہائی جمپ، چھ سو میٹر کی ریس اور کچھ اور مقابلوں میں بھی کافی سارے میڈلز حاصل کیے تھے۔ ان انعامات کے علاوہ انہوں نے ایک خوبصورت پینٹنگ بنائی تھی جس پر امریکہ کے مختلف اخبارات نے اُنہیں بہت سراہا تھا۔

سُمیرا کے اتنے ڈھیر سارے انعامات کی تفصیل سُن کر اس حوصلہ مند بچّی پر رشک آنے لگا۔۔ میں نے سُمیرا سے پُوچھا سمیرا اتنی بہت سی ACTIVITIES میں حصّہ لیتے ہوئے یا پڑھتے لکھتے ہوئے کوئی دشواری تو پیش نہیں آتی ؟

نہیں .... کوئی خاص نہیں ... اپنے مضامین بھی آرام سے پڑھ لکھ لیتی ہوں، البتہ ریاضی میں قدرے دشواری ہوتی ہے۔

آپ کے لکھنے اور پڑھنے کا طریقہ کیا ہوتا ہے .... ؟ میں نے پوچھا۔

میں برل سسٹم سے پڑھتی ہوں یعنی اُبھرے ہوئے حروف کو چھُو کر محسوس کرنا اور سمجھنا، یا پھر کبھی کبھار کسی کو معاوضہ دے کر اُس سے سُن لیتی ہُوں ... لکھنے کے لیے تو ٹائپ کرنا پڑتا ہے اور یہی طریقہ بہتر بھی ہے۔

سب سے زیادہ مزہ کس مضمون کو پڑھ کر آتا ہے، میں نے جاننا چاہا۔

مجھے تو انگلش آسان لگتی ہے اس لیے مزہ بھی آتا ہے، انگلش کے علاوہ فرنچ میں بھی مزہ آتا ہے۔

کبھی اسکول میں کسی بچے نے آپ کی دل آزاری تو نہیں کی ؟

نہیں، میرے ساتھی، میرے اساتذہ سب بہت اچھے ہیں، بہت خیال رکھتے ہیں۔

بچوں کا ذکر آیا تو میں نے سُمیرا سے امریکہ اور پاکستان کے بچوں سے متعلق کچھ باتیں پوچھیں جس کے جواب میں اُس نے بتایا۔

پاکستانی بچے بہت اچھے ہیں، بچے تو امریکہ کے بھی اچھے ہیں مگر وہاں بچوں اور بڑوں میں کوئی تمیز نہیں ہے، سب لوگ آپس میں بہت زیادہ بے تکلف ہو جاتے ہیں، جبکہ میرا خیال ہے کہ بڑوں اور چھوٹوں میں کچھ فاصلہ ہونا چاہیے۔ اِس لحاظ سے پاکستانی بچے بہتر ہیں، بڑوں کے سامنے زیادہ نہ بولنا اور اُن کا احترام کرنا اچھا لگتا ہے۔

سُمیرا نے بتایا کہ وہ امریکہ میں رہ کر باقاعدگی سے نماز پڑھتی ہیں البتہ پاکستان میں کچھ گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

نماز پر مُجھے یاد آیا کہ وہاں یہودی یا عیسائی لڑکیاں آپ کو نماز پڑھتا دیکھ کر آپ پر تنقید تو نہیں کرتیں۔؟

نہیں نماز پر تو تنقید نہیں کرتیں اس لیے کہ عبادت کا تصور تو ان کے ہاں بھی ہے البتہ یہ ضرور کہتی ہیں کہ پاکستان میں حرام حلال کا فرق کیوں ہے؟ اسی طرح سے شراب وغیرہ سے متعلق خرافات سوال کرتی ہیں۔

تو اس بحث میں کون جیتتا ہے؟

کوئی بھی نہیں جیتتا لیکن ہم لوگ انہیں اپنی معلومات کے مطابق جواب دے کر مطمئن کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں، اگر کوئی بات نہ معلوم ہو تو امی ابو سے پوچھ لیتے ہیں۔

سمیرا سچ سچ بتائیے کہ وہاں اسکول یا گھر میں کبھی پٹائی ہوئی؟

اسکول میں پٹائی کا تو کوئی تصور ہی نہیں ہے، کوئی اور ہلکی پھلکی سزا دے دی جاتی ہے، گھر میں کبھی کبھار ڈانٹ پڑ جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ ہماری بہتری کے لیے ہوتی ہے۔ بہنوں سے کبھی کبھار لڑائی جھگڑا بھی ہو جاتا ہے، یہ لڑائی بھی کپڑوں یا کسی اور چیز پر ہو جاتی ہے لیکن پھر خود بہ خود ختم بھی ہو جاتی ہے اور ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں..... اس سے زیادہ لڑائی یا پٹائی کا کوئی تصور نہیں۔ مجھے پاکستانی والدین سے بھی یہی کہنا ہے کہ بچوں کو مارا پیٹا نہ کریں یہاں کے بچے تو ویسے ہی اتنے اچھے ہیں۔

گھریلو مصروفیات کے بارے میں سُمیرا نے بتایا کہ وہ گھر کے برتن دھوتی ہیں۔ استری کر لیتی ہیں، کپڑے بھی کبھی کبھار دھو لیتی ہیں، البتہ کھانا پکانے کی کوشش اس لیے نہیں کرتیں کہ آگ کے قریب جانا خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔

سُمیرا پڑھ لکھ کر کچھ کرنا چاہتی ہیں؟ میں نے پوچھا۔

ہاں PERFORMING ARTS میں نام پیدا کرنا چاہتی ہوں، میرا مطلب ہے میوزک سیکھنا اور سکھانا کیونکہ یہ میرے لیے آسان بھی ہے اور اس سے دِل بھی بہل جاتا ہے، میں ایک مشہور کلاسیکل کمپوزر BEETHOVEN سے متاثر ہوئی جو سُن نہیں سکتا تھا اس سے میرے اس خیال کو تقویت ملی کہ میں بھی کچھ کر سکتی ہوں، میوزک کی دُنیا

میں STEEVY WONDER اور RAY CHARLES بھی بہت بڑے نام ہیں، میں اُن سے متاثر ہوں۔

سُمیرا! حیرت ہے کیا یہ آپ کی سب سے بڑی خواہش ہے۔؟

نہیں سب سے بڑی تو نہیں... سب سے بڑی خواہش تو یہ ہے کہ قرآن شریف بریل سسٹم میں آجائے تاکہ وہ لوگ جو دیکھ نہیں سکتے وہ بھی قرآن شریف پڑھ سکیں۔

خدا کرے آپ کی یہ خواہش جلدی پوری ہو، اس دُعا کے ساتھ ہی میں نے سُمیرا سے وہ سوال بھی پوچھ لیا جو میں بہت دیر سے پوچھنا چاہ رہا تھا مگر مجھے یہ سوال پوچھنے کے لیے نہ مناسب موقعہ مل رہا تھا نہ موزوں الفاظ سو میں نے سُمیرا سے کہا۔

سُمیرا... تمھاری آنکھوں سے متعلق کوئی بات پوچھوں تو تمھاری دل آزاری تو نہیں ہو گی؟

نہیں ہرگز نہیں... ضرور پوچھیے...

سُمیرا کے جواب سے میری ہمت بندھی اور میں نے بہت سے سوالات کیے جن کے جواب میں سمیرا نے بتایا کہ جب میں پیدا ہوئی تو مجھے بہت تیز بخار تھا، عام ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ مجھے اس وقت غلط دوائیں دے دی گئی تھیں جس سے بینائی جاتی رہی۔ اللہ کی طرف سے ایسا ہونا تھا ہو گیا... لیکن میں نے اسے کبھی مجبوری یا معذوری نہیں سمجھا۔ آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا میں زندگی کے تمام معمولات میں پوری دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتی ہوں... میں بہت مطمئن ہوں اور اپنے طور سے آگے بڑھنے کی جدوجہد کر رہی ہوں.... میرے دوست، والدین، بہن، بھائی، اساتذہ سب بہت اچھے ہیں۔ میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں، میرا دل بڑھاتے ہیں، اپنے اسکول اور گھر میں بھی مجھے تمام راستے اور جگہیں یاد ہیں، میں آرام سے چل پھر لیتی ہوں، اسکول کی چھٹیاں ختم ہونے پر ایک نوٹ بلٹی مین آتا ہے جو مجھے پورے اسکول میں چلا پھرا کر راستے یاد کروا دیتا ہے اُس کے بعد مجھے کوئی دقت نہیں ہوتی.....

ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ لائٹ چلی گئی.... بینائی کے تذکروں میں روشنی کے یوں اچانک چلے جانے سے ایک

بار پھر یہ احساس شدت کے ساتھ ہُوا کہ آنکھیں کتنی بڑی نعمت ہیں! روشنی کے اچانک جانے پر ابھی پلکیں جھپکی بھی نہ ہوں گی کہ سُمیرا نے کہا "روشنی چلی گئی؟"

میں نے حیرت سے کہا.... ہاں چلی گئی.... مگر تمھیں کیسے پتا چلا؟

میں روشنی اور اندھیرے میں تمیز کر لیتی ہوں، سُمیرا نے بتایا۔

یہ تمیز تو آنکھیں رکھنے والے بھی بہت سے لوگ نہیں کر سکتے میں نے سوچا اور اندھیرے میں اُٹھتے ہوئے سُمیرا سے کہا.... سُمیرا ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں.... تمھاری آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی....؟

ہاں.... ڈاکٹر اُمید بندھاتے ہیں، کہتے ہیں تحقیق ہو رہی ہے۔ امکان ہیں کہ اچھے نتائج نکلیں اور آنکھوں کی روشنی لوٹ آئے۔ سُمیرا کے اس جُملے پر گھر کی لائٹ آگئی.... اندھیرا گھر روشن ہو گیا۔

سُمیرا نے کہا..... روشنی لوٹ آئی۔

میں نے کہا۔ ہاں..... خدا کرے تمہاری آنکھوں کی روشنی بھی لوٹ آئے..... تم بھی اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے رنگ اور روشنیاں دیکھو..... ہم تمہارے لیے دُعا گو ہیں.....

ہمارے ہزاروں لاکھوں ساتھی بھی تمہارے لیے دُعا کریں گے اور تمہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

ماہنامہ آنکھ مچولی سالِ نو کے آغاز پر

ایک نئی خوشخبری کے ساتھ منظرِ عام پر طلوع ہوگا۔

خوبصورت تحفے کے ساتھ خاص نمبر کی اشاعت تو آنکھ مچولی کی روایت بن چکی ہے۔ اب آپ کا یہ مقبول ماہنامہ اس سے بھی چند قدم آگے...

تفصیلات کا انتظار کیجیے!

بکری کے دو بُدھو بچّے

پروفیسر عنایت علی خان

●

اک بکری کے دو بچّے تھے
عقل کے دونوں ہی کچّے تھے

ایک کا نام تھا بُدّھو مینا
ایک کا نام تھا بُدّھو چینا

جنگل سے جب بکری آتی
آتے ہی دونوں کو بُلاتی !

پیارے مینا پیارے چینا
دونوں اک اِک تھن سے پینا

دونوں کا ہوتا یہ ارادہ !
دودھ پیوں میں اس سے زیادہ

اس کو میں دے دُوں گا دھکّا
پی لُوں گا دونوں ہی تھنوں کا

تیزی سے جب دونوں آتے
آپس میں دونوں ٹکراتے

دونوں کے سر یُوں لڑ جاتے
یہ موٹے گُومڑ پڑ جاتے !

بکری بھی اُن کو دھمکاتی !
دُودھ کے بدلے ڈانٹ پلاتی

جس دن بھی وہ لاپرواہی کرتے
گھنٹوں ٹھنڈی آہیں بھرتے

اشکوں سے منہ دھونا پڑتا
رات کو بھوکا سونا پڑتا !

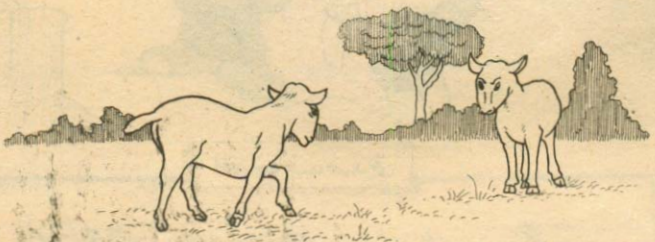

دوسرا اور آخری حصہ

اور پنکی قتل کر دی گئی

لومڑ لیمیٹڈ، پرائیویٹ سراغرساں کے پاس بیگم خرگوش نے اپنی نواسی پنکی کے غائب ہونے کی رپورٹ کی اور کہا کہ وہ اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ مسٹر لومڑ ان کو اپنے ساتھ لے کر مینڈک ٹرٹر کے ریستوران پہنچے اور ریستوران کے مالک مسٹر ٹرٹر نے پنکی کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ اس نام کی کوئی شخصیت یہاں نہیں آئی۔ اتنے میں مسٹر اُلو بھی وہاں آ پہنچے۔ پہلی منزل سے مسٹر سارس لم ڈھینگ بھی اُترتے نظر آئے۔ مسٹر لومڑ نے ان سے بھی پنکی کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اسٹور روم سے ایک سفید خرگوش کی لاش نکال کر ہال کے قالین پر اُچھال دی۔ یہ بیگم خرگوش کی نواسی پنکی کی لاش تھی

اب آپ اس سنسنی خیز کہانی کا آخری حصہ ملاحظہ کیجیے۔

الحمد حاطب صدیقی

ایک قتل جس پر جانوروں کی دنیا میں ہنگامہ بپا ہو گیا

"اوہ !۔۔۔ میں تو کچھ دیکھ نہیں سکتا، صرف آوازیں پہچان سکتا ہوں"۔ مسٹر اُتو افسردہ ہو گئے۔

"یہ ایک مرا ہُوا خرگوش ہے"۔ چُوچُو چوہے نے معلومات میں اضافہ کیا۔

"میں قاتل کو آواز سے پہچان لُوں گا"۔ مسٹر اُتو نے اپنے عزم کا اعلان کیا۔

"آئیں ہائیں"۔ مسٹر ٹرٹَر نے آہ بھری اور چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں اور منہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا تھا۔ تمام جگنو خوفزدہ ہو کر بُجھ گئے۔ سبز ہال بالکل تاریک ہو گیا۔ اچانک اندھیرے میں سرسراہٹ کی ایک آواز آئی اور کوئی چیز دھپ سے قالین پر گر گئی۔ جگنو ذرا دیر کو جگمگائے تاکہ دیکھیں کہ کیا ہو گیا ہے۔ مسٹر اُتو کی لاش قالین پر پڑی ہوئی تھی۔ کسی نے ان کی گردن پر کوئی تیز دھار چیز پھیر دی تھی!

چُوچُو چوہا، مینڈک ٹرٹَر، سارس لم ڈھینگ، بوڑھی بیگم خرگوش اور مسٹر لومڑ، سب مسٹر اُتو کی میّت کو گھور رہے تھے۔

"قتل؟!!" بیگم خرگوش نے سِسکاری بھری۔

"کوئی شخص ہال سے باہر نہ جائے۔ قاتل یہیں ہے!" مسٹر لومڑ نے بلند آواز میں کہا۔

"میں مرنے کا عادی نہیں ہوں"۔ سارس لم ڈھینگ نے کہا اور باہر جانے لگا۔

مسٹر لومڑ نے کسی تیز دھار آلے کی تلاش میں ہر ایک کی تلاشی لی۔ مگر کسی کے پاس سے کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔

"تم نے ان دونوں کو اپنی لمبی چونچ سے مار دیا ہے"۔ مسٹر لومڑ نے سارس لم ڈھینگ سے کہا۔

"ذرا ان کے جسموں پر میری چونچ کا نشان دکھاؤ"۔ سارس نے اُنھیں لاجواب کر دیا۔

"تم نے اپنے تیز دانتوں سے اُنھیں کُتر ڈالا ہے"۔ مسٹر لومڑ نے چُوچُو چوہے سے کہا۔

"بھلا میرے کُتر ڈالنے سے یہ مَر جائیں گے؟" چوہے نے سوال کیا۔

"تم نے اپنے بھدّے چہرے سے ڈرا کر انھیں مار ڈالا ہے"۔ مسٹر لومڑ نے مینڈک ٹرٹَر سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اگر ایسا ہوتا تو تم اور بیگم خرگوش بھی مر چکے ہوتے"۔ مسٹر ٹرٹَر، زور سے ٹرّائے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو"۔ مسٹر لومڑ بولے، پھر چونک کر پوچھا۔"بیگم خرگوش کہاں ہیں؟"

"میں یہاں چُھپی ہوئی ہوں!" بیگم خرگوش سیڑھیوں کے ساتھ بنے ہوئے چھوٹے سے اسٹور رُوم میں سے کپکپاتی ہوئی آواز میں بولیں۔ پھر کہنے لگیں "میں ڈر گئی ہوں"۔

مسٹر لومڑ بھی اسٹور رُوم میں داخل ہو گئے اور اِدھر اُدھر کچھ تلاش کرنے لگے۔ اچانک اُنھوں نے جُھک کر کوئی چیز اُٹھائی اور اپنی جیب میں رکھ لی۔

"تم نے کیا چیز اُٹھائی"۔ چُوچُو چوہے نے تشویش سے پوچھا۔

"ایک ثبوت!" مسٹر لومڑ نے کہا۔
دروازہ کھلا اور انسپکٹر بھوُ بھوُ اور سب انسپکٹر قُوئی قُوئی اندر داخل ہوئے۔
"ارے یہاں کیا ہوگیا؟" سب انسپکٹر قُوئی قُوئی نے حیرت سے پُوچھا۔
"دوہرا قتل!" انسپکٹر بھوُ بھوُ نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
"میں مسٹر اُتو کو تو پہچان گیا، مگر یہ مرحوم خرگوش کون ہے؟" سب انسپکٹر قُوئی قوئی نے پُوچھا۔
"میری بہت بہت بہت پیاری نواسی" بوڑھی بیگم خرگوش نے بتایا۔
"ارے نہیں!" مسٹر لومڑ اچانک بیگم خرگوش سے مخاطب ہوئے اور بولے "وہ نہیں، بلکہ تم خود اس کی بہت بہت بہت پیاری نواسی ہو! اور تم بیگم خرگوش نہیں، پنکی ہو" پنکی خرگوش کی گلابی آنکھوں میں سفید چمک پیدا ہوئی۔ مسٹر لومڑ مزید کہہ رہے تھے۔
"تم نے بوڑھی بیگم خرگوش کو قتل کر دیا، تاکہ اس کے گاجر کے کھیت پر قبضہ کر سکو اور تم ہی نے مسٹر اُتو کو بھی قتل کیا ہے، تاکہ وہ تمھیں آواز سے پہچان نہ سکے۔ اور تمھارا راز فاش نہ ہو سکے"
"میں تمھیں بھی قتل کر دُوں گی" پنکی نے اپنا راز فاش ہوتے دیکھ کر دھمکی دی۔
"قُوئی قُوئی! فوراً اِس خرگوش کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دو" انسپکٹر بھوُ بھوُ نے کہا۔
سب انسپکٹر قُوئی قُوئی آگے بڑھ کر مُردہ خرگوش کی اگلی ٹانگوں میں ہتھکڑیاں ڈالنے لگا۔
"اس کے نہیں، بے وقوف!" انسپکٹر بھوُ بھوُ زور زور سے بھونکنے لگا اور دہاڑا "پنکی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالو، جلدی کرو"
مگر اب جلدی کرنا بیکار تھا، کیونکہ دیر ہو چُکی تھی۔ پنکی نے ایک چھلانگ لگائی اور کھڑکی سے باہر کُود گئی۔ انسپکٹر بھوُ بھوُ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اور سب انسپکٹر قُوئی قُوئی اس کے پیچھے دوڑ گئے!

"بھئی مجھے تو سارے خرگوش ایک جیسے لگتے ہیں، تم نے آخر کس طرح پنکی کو پہچانا" انسپکٹر بھوُ بھوُ نے مسٹر لومڑ سے پوچھا۔
"میرے دفتر سے مسٹر ٹر ٹر کے ریستوران تک آتے ہوئے اُس نے جس تیز رفتاری سے راستہ طے کیا ہے، وہ کسی بڑی بی کے بس کی بات نہیں" مسٹر لومڑ نے بتایا۔
"لیکن تم کسی کو اس کی تیز رفتاری کی وجہ سے پھانسی پر نہیں لٹکا سکتے" انسپکٹر بھوُ بھوُ بولے۔
"ٹھیک ہے، آگے سنو! جس خرگوش نے صبح مجھ سے ملاقات کی، اُس نے مجھے جو تصویر دکھائی تھی۔ اُس کی

پُشت پر لکھا تھا۔ "پنکی اپنی دوسری سالگرہ کے موقعے پر"۔

لیکن مجھے اُس نے یہ بتایا کہ پنکی صرف اٹھارہ ماہ کی ہے۔ اپنی عمر میں سے اُس نے چھ ماہ یکلخت کم کر دیے۔ وہ یہ بھی نہ پڑھ سکی کہ تصویر کی پُشت پر کیا لکھا ہے۔ کیونکہ نظر کا چشمہ بھی اُس کا اپنا نہیں تھا۔"

"اچھا ایک منٹ" انسپکٹر بھوؤ بھوؤ بولے۔ "یہ بتاؤ، اُس نے مسٹر اُلو کو کیوں قتل کر دیا؟"

"سیدھی سی بات ہے۔ مسٹر اُلو آواز سے پنکی کو پہچان لیتے اور چونکہ ناریل کے پیڑ پر ان کی رہائش ہے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے رات کو پنکی کو دیکھ بھی لیا ہو کہ وہ اپنی نانی اماں کی لاش لے کر "ٹُر ٹُر ریسٹورنٹ" میں داخل ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے مسٹر اُلو کو قتل کر دیا۔"

"کیسے قتل کیا؟" انسپکٹر بھوؤ بھوؤ نے پوچھا۔

"اپنے پچھلے دائیں پنجے سے، خرگوش کے پنجے بہت تیز ہوتے ہیں۔"

"تم نے اسٹور رُوم میں سے کیا اُٹھایا تھا؟" چُوچُو چوہے نے مسٹر لومڑ سے پوچھا۔

"گاجر" انسپکٹر لومڑ نے جواب دیا۔

"گاجر؟!!!" سب نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ پنکی کے پھانسی کے پھندے کی آخری گرہ!" مسٹر لومڑ نے بتانا شروع کیا۔ "میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اسٹور میں چھپنے کے لیے نہیں گئی ہے۔ اُسے کسی چیز کی تلاش ہے، جو کل رات کو یہاں گر گئی ہوگی۔ اگر وہ ڈر گئی ہوتی تو اُسی وقت وہاں چھپ جاتی جب جگنوؤں نے روشنی بند کر دی تھی، لیکن وہ اُس وقت گئی، جب وہ دوبارہ چمک اُٹھے تھے۔"

"ٹھیک ہے!" انسپکٹر بھوؤ بھوؤ بولے۔ پھر انھوں نے پوچھا: "لیکن اُسے آخر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی اور تم سے مدد کی درخواست اُس نے کیوں کی؟"

"اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہاں کیا گرا ہے، کل رات اُس نے صرف کچھ گرنے کی آواز سُنی ہوگی، وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اُس کا کوئی بٹن، کوئی بکل، کوئی بُندہ، کوئی موتی یا کوئی چوڑی وغیرہ گر گئی ہے، جس سے وہ پکڑی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے میرے دفتر بمعہ مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ کیونکہ وہ اکیلے آ کر یہاں کی تلاشی نہیں لے سکتی تھی۔"

"ایک سوال اور!" انسپکٹر بھوؤ بھوؤ نے پوچھا: "اُس نے اپنی نانی اماں کی لاش ٹُر ٹُر ریسٹورنٹ میں کیوں لا پھینکی؟"

"سیدھی سی بات ہے۔" مسٹر لومڑ نے کہا۔ "وہ چاہتی تھی کہ قتل کا شُبہ صرف اُسی پر نہ کیا جائے۔ بلکہ بہت سارے لوگوں پر کیا جائے، ان تمام لوگوں پر جو ٹُر ٹُر ریسٹورنٹ میں آتے ہیں۔"

چُوچُو چوہا، دیوار کے قریب پہنچ کر غائب ہو گیا۔ مینڈک ٹُر ٹُر اپنے دفتر کی طرف واپس چل دیا۔

سارس لم ڈھینگ کہنے لگا "مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا" وہ اُڑ کر باہر کے دروازے تک پہنچا۔ سارس لم ڈھینگ کو دروازہ کھولتے ہی نہ جانے کیا نظر آیا کہ اُس نے شور مچا دیا۔

سب لپک کر دروازے تک پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پنکی دروازے سے لگی کھڑی ہے اور سب انسپکٹر تُوتی قُوتی نیچے بے ہوش پڑے ہیں۔ انسپکٹر بھُوبھُو نے دہاڑتے ہوئے پوچھا "کیا یہ مر گیا؟"

"نہیں مرا نہیں ہے، صرف بے ہوش ہو گیا ہے۔" پنکی نے جواب دیا اور کہا "مجھے گرفتار کر لو!"

انسپکٹر بھُوبھُو نے اُسے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

مسٹر لومڑ آگے بڑھے اور انھوں نے اس کے پنجے کا جائزہ لیا۔ پچھلے دائیں پنجے کا۔

"اُلّو کی دُم۔۔۔ اُلّو کی دُم!" انسپکٹر لومڑ نے چلّا چلّا کر خرگوش پنکی کے پچھلے دائیں پنجے کی طرف اشارہ کیا۔ جس میں اُلّو کی دُم کے بال پھنسے ہوئے تھے۔ پنکی پر دوسرے قتل کا الزام بھی ثابت ہو گیا۔

"مسٹر لومڑ، تمھارا بہت بہت شکریہ، تم نے اتنی مشکل گتھی سلجھا دی!" انسپکٹر بھُوبھُو نے خوش اخلاقی سے مسٹر لومڑ سے ہاتھ ملایا۔

"صرف شکریے سے کام نہیں چلے گا۔ ابھی میں اپنی سیکریٹری مس مانو سے اس کیس کی ساری رپورٹ ٹائپ کرواؤں گا۔ اور صبح تمھیں اس رپورٹ کے ساتھ "لومڑ لمیٹڈ۔ پرائیویٹ سُراغ رساں" کی طرف سے ایک بل موصول ہو گا۔ اس کی ادائیگی جلد کروا دینا۔"

انسپکٹر بھُوبھُو نے بُرا سا منہ بنایا "میری قسمت ہی خراب ہے، کبھی کسی کیس کو خود نمٹانے کا موقع نہیں ملا!"

پھر وہ سب ٹُرٹُر ریسٹورنٹ اینڈ سوئمنگ پُول سے باہر نکل آئے۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کا مقبول ترین سلسلۂ تحریر

اخلاق احمد کی مُہماتی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ

- بُرائیوں سے برسرِ پیکار ۱۴ کمسن مجاہدوں کے کارنامے
- ذہانت اور شجاعت سے بھرپور حیرت انگیز واقعات
- خوبصورت اسکیچز۔ بہترین تصاویر۔ اعلیٰ طباعت

حسین سرورق اور ۱۰۰ سے زائد صفحات

"حق اسکواڈ" حاصل کرنے کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ بھجوا دیں

نیّر ابدالی

سائنس انکوائری

ستارے کتنے ہیں

ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ ہماری کائنات میں کتنے ستارے موجود ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم ان سب کو ایک ساتھ نہیں دیکھ سکتے۔ چاہے ہمارے پاس کتنی ہی طاقتور دوربین کیوں نہ موجود ہو۔ ہماری زمین بھی ایک چھوٹا سا سیارہ ہے جو ایک اوسط درجے کے ستارے یعنی سورج کے گرد اپنی گردش مکمل کر رہی ہے۔ سورج بھی کہکشاں کے ہزاروں ستاروں میں سے ایک ہے۔ ایک عام اندازہ یہ لگایا گیا ہے کہ اس کائنات میں لاکھوں کہکشائیں موجود ہیں۔ یعنی اگر ان سب ستاروں کو کسی بھی طرح دیکھ لیں تب بھی ہماری گنتی اور ہمارے اعداد ختم ہو جائیں گے مگر ہم پھر بھی نہیں کہہ سکتے کہ ستارے کتنے ہیں؟

پھیپھڑے کا استعمال

خشکی پر رہنے والے تقریباً سبھی جانور پھیپھڑے سے سانس لیتے ہیں۔ انسانوں میں دو پھیپھڑے ہوتے ہیں اور سانس کی نالی کی دو شاخیں دونوں میں موجود ہوتی ہیں۔ جب ہم سانس لیتے ہیں تو ہمارے پھیپھڑے پھول جاتے ہیں۔ اور ہوا کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ ہوا خون کی نالیوں میں چلی جاتی ہے۔ جہاں آکسیجن خون میں جذب ہو جاتی ہے۔ اور کاربن ڈائی آکسائیڈ دوبارہ سانس کے اخراج کی صورت میں باہر نکل جاتی ہے۔ یہ عمل متواتر ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ نیند کی حالت میں بھی کیا انسان اور کیا حیوان سب ہی سانس لیتے رہتے ہیں۔

گیزر

آپ نے اپنے گھر میں غسل خانے اور باورچی خانے میں گرم پانی کے حصول کے لیے گیزر لگا ہوا دیکھا ہو گا۔ یہ ایک ایسا آلہ ہوتا ہے جو پانی کو فوراً گرم کر دیتا ہے۔ اس کے اندر تانبے کا ایک پائپ لگا ہوتا ہے۔ پانی جب اس میں داخل ہوتا

ہے تو ٹھنڈا ہوتا ہے۔ مگر جب پانی نل سے نکل رہا ہوتا ہے تو گرم ہو چکا ہوتا ہے۔ ویسے گیزر پانی کے اس چشمے کو کہا جاتا ہے جو ایک تیز دھار کی صورت میں گرم پانی یا بھاپ کو خارج کرتا ہے۔ بعض اوقات پانی کے اندر موجود چٹانوں کے نیچے شدید گرمی ہوتی ہے جس کی وجہ سے پانی گرم ہو کر یا بھاپ کی صورت میں باہر نکل پڑتا ہے۔ گیزر ان علاقوں میں خاص طور پر پائے جاتے ہیں جہاں آتش فشاں موجود ہوں یا رہ چکے ہوں۔ مثال کے طور پر آئس لینڈ، نیوزی لینڈ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ وغیرہ۔ لفظ گیزر" آئس لینڈ سے نکلا ہے اسی اصول کے تحت گھریلو گیزر بنائے گئے جو عام گھریلو استعمال میں بہت کام آتے ہیں۔

خطرناک بجلی

آپ نے خراب موسم یا بارش کے دوران بجلی چمکتی ہوئی ضرور دیکھی ہوگی۔ بجلی قدرتی توانائی کا اخراج ہوتی ہے۔ یہ ہوتی بھی خطرناک ہے۔ آپ نے اکثر اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ بجلی گرنے سے مکان یا درخت میں آگ لگ گئی اتنے افراد ہلاک ہو گئے۔ اس لیے تیز بارش یا طوفان کے وقت کبھی بھی کسی درخت کے نیچے نہیں کھڑے ہونا چاہیئے۔ کیونکہ درخت پر بجلی گرنے کا بڑا امکان ہوتا ہے۔ آج کل بڑی عمارتوں اور مکانات میں دھات کی ایسی پٹیاں یا کنڈکٹر لگے ہوتے ہیں جو بجلی گرنے کی صورت میں اُسے اپنے اندر جذب کر کے زمین میں پہنچا دیتے ہیں مگر چونکہ درختوں پر ایسے انتظامات ممکن نہیں اور چونکہ درخت بجلی اور حرارت کا اچھا موصل ہوتے ہیں اس لیے بجلی گرنے کی صورت میں اس کے آس پاس موجود فرد اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتا ہے۔

کرومیم

کرومیم ایک ایسی دھات ہے جس پر زنگ نہیں لگتا۔ اس اہم دھات کو ایک فرانسیسی کیمسٹ واکلین VAU QUELIN نے ۱۷۹۷ء میں دریافت کیا۔ زنگ نہ لگ سکنے کی بنا پر کرومیم کو ایسی دھاتوں پر لگا دیا جاتا ہے جو زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات دھات پر اس کی ایک پتلی سی تہہ چڑھا دی جاتی ہے۔ اس عمل کو "کرومیم پلیٹنگ" کہا جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی دھات کے پگھلاؤ کے وقت یہ اُس میں شامل کر دی جائے۔ اس کی ایک مثال اسٹین لیس اسٹیل کے برتن ہیں۔ ان برتنوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان پر زنگ نہیں لگ سکتا۔ چاہے یہ برتن مہینوں پانی یا نم جگہوں پر پڑے رہیں۔ بظاہر عام سے لوہے میں کرومیم شامل کر کے جو "اسٹین لیس اسٹیل" یعنی زنگ سے پاک اسٹیل حاصل ہوتا ہے وہ عام برتنوں کے مقابلے میں زیادہ عرصہ چل جاتا ہے۔ اسی طرح موٹر سائیکلوں، اسکوٹروں اور کاروں کے بمپر وغیرہ پر بھی کرومیم چڑھا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان حصوں پر زنگ کبھی نہیں لگ سکتا۔

بُلبُلے کی کشتی

آپ میں سے بہت سے ساتھی کبھی نہ کبھی کشتی میں ضرور بیٹھے ہوں گے۔ آج ہم آپ کو کشتی بنانا سکھائیں گے۔ اس کو بنانے کے لیے آپ کو پلاسٹک کی ایک بڑی بوتل، کھانے کا سوڈا، سرکہ، اسٹرا، ٹشو پیپر، قینچی اور گلو کی ضرورت پڑے گی۔ سب سے پہلے بوتل کے پیندے میں ایک سوراخ کریں پھر اسٹرا کو بوتل میں اتنا ڈال دیں کہ اس کا ایک سینٹی میٹر حصہ بوتل سے باہر نکلا ہُوا ہو۔ اسٹرا جس سوراخ میں گیا ہو اُسے گلو سے مضبوطی سے بند کر دیں۔ اب ایک ٹشو پیپر پر تھوڑا سا کھانے کا سوڈا لے کر اسے آپس میں ملائیں پھر اس کاغذ کے دونوں کناروں کو اس طرح موڑ دیجیے جیسا کہ چاکلیٹ کے کاغذ مُڑے ہوتے ہیں پھر اس کو بوتل کا ڈھکن ہٹا کر اس میں ڈال دیجیے۔ اب بوتل میں تھوڑا سا سرکہ ڈالیے اور جلدی سے ڈھکن بند کر کے بوتل کو پانی کے ایک بڑے سے ٹب میں چھوڑ دیجیے۔ واہ! آپ کی "کشتی" تو بڑی روانی سے چلنے لگی ہے۔

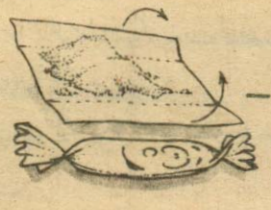

آپ حیران ہوں گے کہ یہ سب کچھ کس طرح ہو گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جونہی سرکہ بوتل کے کھانے کے سوڈے سے ملا اُسی وقت گیس بننے لگی اور اسٹرا کے راستے جھاگ باہر نکلنے لگا۔ اور اسی اسٹرا کے راستے گیس بھی تیزی سے باہر نکلنے لگی۔ جس کے نتیجے میں "کشتی" آگے بڑھنے لگی۔

منتخب لطائف
اور مزے دار کارٹونز کے
کھٹ مٹھے

انعامی لطیفہ

ماسکو کے ایک پرائمری اسکول میں استاد نے شاگردوں سے مخاطب ہو کر کہا

"ہم کتنے خوش نصیب ہیں جو روس میں پیدا ہوئے۔ ہمارے یہاں ہر خاندان کے لیے نفیس ترین اپارٹمنٹس مفت ہیں۔ اعلیٰ درجے کی خوراک اور بچوں کے لیے جدید ترین اسکول اور کھلونے فراہم ہیں۔ روس کسی جنت سے کم نہیں۔"

یہ سُن کر ایک شاگرد کھڑا ہوا اور بولا،

"سر میں بھی رُوس جا کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔"

حسن مہدی خراسانی - کراچی

ایک پاگل کسی طرح پاگل خانے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ پاگل کا تعاقب کرنے والے محافظ نے ایک جگہ رُک کر ایک شخص سے پوچھا۔

"کیا آپ نے کسی پاگل کو ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے؟"

"اس کا حلیہ کیا ہے؟" راہ گیر نے پوچھا۔

"قد چھوٹا، جسم دُبلا پتلا اور وزن تقریباً تین من کے قریب۔"

"مگر چھوٹے سے قد کے آدمی کا وزن تین من کیسے ہو سکتا ہے؟" راہ گیر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے بھئی ... اس لیے کہ وہ پاگل ہے۔" محافظ نے جواب دیا۔

سرفراز حسین زیدی، (جگہ نامعلوم)

استاد (شاگرد سے) "پھل توڑنے کا بہترین موسم کون سا ہوتا ہے؟"

شاگرد - جب باغ میں مالی موجود نہ ہو۔"

قیصر محمود، آزاد کشمیر

جغرافیہ کا استاد (شاگرد سے) "کیا تم جغرافیہ کی تعریف یاد کر کے آئے ہو؟"

شاگرد - "نہیں جناب۔"

استاد ۔ (غصے سے) "کیوں نہیں کر کے آئے؟"

شاگرد: "کل میں نے ایک سیاسی جلسے میں سیاست دان کی تقریر سُنی ۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہم جلد ہی دنیا کا نقشہ بدل دیں گے۔"

ارشد محمود، (مقام نامعلوم)

ٹائپسٹ کی ملازمت کے لیے امیدواروں کا انتخاب ہو رہا تھا ۔ ایک امیدوار سے انٹرویو کرنے والے نے پوچھا "آپ ٹائپنگ کے علاوہ اور کیا کام جانتے ہیں؟"

امیدوار ۔ "مذاق کرنا۔"

انٹرویو نگار: "کیا آپ عملی مظاہرہ کرنا پسند کریں گے؟"

امیدوار ۔ "کیوں نہیں۔" امیدوار نے یہ کہا اور دفتر کے باہر آ کر لائن لگا کر بیٹھنے والے دیگر امیدواروں سے کہا: "آپ سب حضرات جا سکتے ہیں ۔ کیونکہ میرا انتخاب کر لیا گیا ہے۔"

مبشر ارشاد، سکھر

تم میرا چالان نہیں کر سکتے۔ کیونکہ میرے ابا ایس پی ہیں

ایک چور مکان میں داخل ہُوا اور تجوری کے پاس جا پہنچا ۔ تجوری پر لکھا ہُوا تھا ۔ بٹن کو دائیں گھمایئے ۔ چور نے ایسا ہی کیا تو سائرن بج اُٹھا اور چور پکڑا گیا ۔ عدالت میں جج نے چور سے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کو کہا تو چور اُداسی کے ساتھ بڑبڑایا ۔

"میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ دنیا بڑی دھوکے باز ہے۔"

ابو اکرم سیال ۔ ننکانہ صاحب

دو افیمی رات کو گھر واپس آ رہے تھے ۔ اُن میں سے ایک کو کُتا دکھائی دیا ۔ تو وہ بڑے ادب سے جھکا اور بولا: "کیسے ہیں ہاتھی ماموں؟"

اس پر دوسرے افیمی نے ٹوکا: "ارے کیا یہ ہاتھی ہے؟"

"مجھے معلوم ہے یہ گھوڑا ہے ۔ دراصل میں تو اسے چھیڑ رہا تھا۔" پہلے افیمی نے اپنی قمیض کا کالر درست کرتے ہوئے کہا ۔

حسنات احمد ۔ فیصل آباد

ایک بوڑھی دیہاتی عورت کافی دیر سے بس کے انتظار میں کھڑی تھی ۔ بس نہ آنے کی وجہ سے اسٹاپ پر خاصا رش تھا ۔ بالآخر بس آگئی ۔ بس کے کنڈیکٹر نے مسافروں سے کہا: "بھئی پہلے لیڈیز کو چڑھ لینے دیں۔"

"گولی مارو لیڈیز کو پہلے مجھے چڑھنے دو۔" بوڑھی عورت نے غصے سے کہا اور بس میں سوار ہو گئی ۔

گل شیر علی، پشاور

شازیہ ۔ (نازیہ سے) "گھاس کھانے سے کبھی

آنکھیں خراب نہیں ہوتیں۔"

"نازیہ: "تم کس بنیاد پر یہ بات کہہ رہی ہو؟"

شازیہ: "میں نے آج تک کسی گھوڑے کو چشمہ لگاتے نہیں دیکھا۔"

اُمِّ کلثوم۔ گوجرانوالہ

اسی لیے کہتی ہوں کہ کم کھایا کر۔

وکیل (مؤکل سے): "جب میں چھوٹا تھا تو میری خواہش تھی کہ میں بڑا ہو کر ڈاکو بنوں۔"

مؤکل: "آپ خوش قسمت ہیں، ورنہ اس دُنیا میں انسان کی ہر خواہش کہاں پوری ہوتی ہے۔"

دلشاد محمد، میاں چنوں

ٹیٹو کے اسکول کی رپورٹ جب اس کے والد کو موصول ہوئی، جس میں والد سے کہا گیا تھا۔

"ٹیٹو کے جسم سے بدبو آتی ہے۔ ذرا دھیان رکھیے۔"

ٹیٹو کے والد نے رپورٹ پر تبصرہ لکھا۔

"آپ کا کام ٹیٹو کو پڑھانا ہے، اس کو سونگھنا نہیں۔"

قاضی شکیل ارشد (مقام نامعلوم)

ایک ماں نے اپنے بیٹے کو ملک کے عظیم رہنما کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارے قومی ہیرو ہیں۔"

بیٹا یہ سُن کر معصومیت سے بولا: "مگر ان کے سر پر ایک بھی بال نہیں ہے پھر یہ ہیرو کیسے بن گئے؟"

شمس بن، بزنس روڈ، کراچی

ایک ذہنی مریض ماہرِ نفسیات کے پاس گیا اور بولا "ڈاکٹر صاحب مجھے یہ بیماری ہو گئی ہے کہ میں اب نائلون کے بجائے سوتی جرابیں پسند کرنے لگا ہوں۔ کیا اس کا علاج ممکن ہے؟"

ماہرِ نفسیات: "بھئی یہ تو کوئی بیماری نہیں، میں تو خود بھی سوتی جرابیں ہی پسند کرتا ہوں۔"

مریض (خوشی سے چلاتے ہوئے) "اچھا ڈاکٹر صاحب ذرا یہ تو بتائیں، آپ جرابیں چٹنی کے ساتھ کھاتے ہیں یا میری طرح اُن پر لیموں نچوڑ کر نوش فرماتے ہیں؟"

محمد ذیشان۔ لاہور

ایک زخمی نوجوان کو اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں لایا گیا تو ڈاکٹر نے نوجوان سے پوچھا۔

"نوجوان! تمھاری ٹانگ کیسے ٹوٹی؟"

"ایک عادت کی وجہ سے ٹوٹی۔" نوجوان نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میں سگریٹ پیتا ہوا جا رہا تھا۔ سگریٹ ختم ہوا تو میں نے اُسے ایک کھُلے ہوئے مین ہول میں پھینک دیا۔ اور پھر عادت کے مطابق سگریٹ کو مسلنے کے لیے اس پر پاؤں رکھ دیا۔" نوجوان نے جواب دیا۔

احمد رضا - لیاقت آباد کراچی

مریض (ڈاکٹر سے) "جب میں صبح جھک کر پہلے ایک اور پھر دوسری ٹانگ اُٹھاتا ہوں تو میری کمر میں شدید درد ہونے لگتا ہے۔ بتائیے میں کس طرح اس درد سے نجات حاصل کروں؟"

ڈاکٹر۔ "آسان بات ہے۔ آپ یہ عمل بند کر دیجیے۔"

مریض۔ "مگر پھر میں پتلون کیسے پہنوں گا؟"

ہدایت علی خان - تھرپارکر

ایک بیمار بچّے کو اُس کے ابّو ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے دل کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے لڑکے کے سینے پر مخصوص آلہ لگایا اور کہا۔

"بیٹے! دس تک گنتی گنو" یہ سُن کر لڑکا گھبرا گیا اور ابّو سے بولا۔

"آپ تو کہتے تھے کہ اسپتال جا رہے ہیں، مگر یہ تو اسکول ہے۔"

چوہدری ایم شہباز ناز - گوجرانوالہ

تھکا ماندہ ڈاکٹر سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر منہ بناتا ہوا اُٹھا اور بستر سے ہی بولا "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی۔ "صاحب دروازہ کھولیے مجھے کتّے نے کاٹ لیا ہے۔"

"کیا تمھیں نہیں معلوم کہ یہ میرے آرام کا وقت ہے" ڈاکٹر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں مجھے تو خوب اچھی طرح معلوم ہے۔ مگر کتّے کو معلوم نہیں۔" باہر سے آواز آئی۔

حنا شرمین، ناظم آباد کراچی

ڈیڈی آپ کتنے اچھے ہیں ہمیں کلاس میں بھی لطیفے

[illegible] چلتے چلتے رُک جاتا تو کوچوان اُتر کر اُس کے سامنے گانا گاتا۔ گانا سُن کر گھوڑا پھر چلنے لگتا آخر تانگے میں بیٹھے ہوئے مسافر نے کوچوان سے پوچھا "بھئی یہ کیا قصّہ ہے۔ تمہارا گھوڑا گانا کیوں سُنتا ہے۔"؟

کوچوان بولا "بابو جی، دراصل یہ بارات کا گھوڑا ہے، گانا سُن کر ہی چلتا"

محمد رفیق راجہ تھرپارکر

سرِورق کی کہانی

سبز پری کی ساتھی

شین فاروقی

ایک پیاری سی بچی کی کہانی جو سبز پری کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔

دس سالہ سوہا پچھلے کئی روز سے سخت خوفزدہ تھی کیونکہ چند روز بعد اُس کی پانچویں کلاس کا رزلٹ آنے والا تھا۔ پہلی کلاس سے اب تک جب بھی اُس کے رزلٹ آنے کے دن قریب آتے وہ خوف زدہ رہنے لگتی۔ ان دنوں میں اُس کا دل چاہتا کہ وہ پندرہ بیس دن کے لیے سو جائے اور اُس کی آنکھ اُس وقت کھُلے جب رزلٹ آچکا ہو، مگر آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔

سوہا فطری طور پر سنجیدہ اور کم گو واقع ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ ایسی فکرمندی چھائی رہتی جیسے ساری دنیا کا نظام چلانا اُس کی ذمہ داری ہو۔ اور اس سے یہ نظام درست طور پر نہ چل رہا ہو۔ سوہا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔

اس بار کے رزلٹ سے تو سوہا اور بھی خوف زدہ تھی۔ آج صبح جب وہ اسکول جانے کے لیے گھوڑا گاڑی میں بیٹھی۔ تو اُس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ سوہا کی گھوڑا گاڑی اسکول پہنچی تو اُس کا پورا جسم سردی کے باوجود پسینے میں بھیگ چکا تھا۔

کلاس روم میں مکمل خاموشی تھی۔ سب بچے مس روبی کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھے۔ مس روبی نے جیسے ہی رزلٹ کی فہرست نکال کر ہاتھوں میں لی سوہا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"انیلا احمد فرسٹ پوزیشن" مس روبی نے اعلان کیا اور کلاس روم میں تالیوں کا شور گونجنے لگا۔

"سوہا امیر علی سیکنڈ پوزیشن" مس روبی نے جیسے ہی یہ کہا سوہا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، جیسے مس روبی نے اُس کے فیل ہونے کا اعلان کر کے اُسے پوری کلاس کے سامنے شرمندہ کر دیا ہو۔ مس روبی سمیت پوری کلاس سوہا کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ مس روبی نے فہرست جلدی سے روسٹرم پر رکھی اور سوہا کے پاس جا کر بولیں۔

"کیا ہوا سوہا؟"

"کچھ نہیں مس" سوہا نے سسکتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ رو کیوں رہی ہیں؟"

"_____"

"بولو ڈارلنگ" سوہا نے کوئی جواب نہ دیا۔

شہر کے دوسرے مہنگے ترین انگریزی میڈیم اسکول کی مس روبی کے لپ اسٹک زدہ ہونٹ انگریزی حرف "او" کی طرح ہو گئے

"سلی گرل" انہوں نے کہا اور کلاس روم کے فرش کی چیخوں سے بے خبر اُسے اپنی اونچی ہیل کے سینڈلوں سے ٹھک ٹھک کچلتی ہوئیں روسٹرم کے پاس جا کر بقیہ نتائج کا اعلان کرنے لگیں۔

"سوہا... سوہا... سوہا... سوہا..." نتائج کے اعلان کے بعد سوہا کی کلاس کے ایک گروپ نے سوہا کے آگے چلتے ہوئے نعرہ لگایا۔ سوہا ہمیشہ کی طرح خاموش اور بے تعلق سی اسکول کے باہر کھڑے تانگے کی جانب بڑھتی رہی۔

گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر گھر آتے ہوئے سوہا کو اپنے ابو شدت سے یاد آئے۔ اس کے ابو کا دو سال پہلے اسلام آباد تبادلہ ہو گیا تھا۔ چونکہ سوہا کی پڑھائی متاثر ہونے کا اندیشہ تھا اس لیے اس کی امی ابھی تک کراچی میں ہی مقیم تھیں۔ سوہا کے ابو مہینے میں دو بار ایک دو دن کے لیے کراچی آتے تھے۔

"کاش آج ابو گھر پر ہوتے... اگر ابو ہوتے تو امی" سوہا نے آنکھیں بند کر کے سوچا۔ تبھی تانگے والے دینو کی نظر

سوہا کے ہاتھ میں خوبصورت سے کاغذ میں لپٹی ہوئی ڈبے نما چیز پر پڑی۔

"انعام ملا ہے سوہا رانی کو" دینو نے گھوڑے کو چابک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بابا" سوہا نے مختصر جواب دیا۔ وہ دینو کو دوسری لڑکیوں کی طرح کبھی بھی دینو کہہ کر نہیں پکارتی تھی۔ وہ اُسے ہمیشہ بابا ہی کہتی، بلکہ پچھلے مہینوں میں کئی بار اُس کا دل چاہا تھا کہ وہ دینو کو دادا جی کہہ کر پکارے مگر جب بھی اُس کا دل یہ کہنے کو چاہتا وہ یہ سوچ کر ڈر جاتی کہ گھوڑا گاڑی میں سوار لڑکیاں اُس کا مذاق اُڑائیں گی۔

دینو کو یوں تو سبھی بچوں سے پیار تھا مگر سوہا اُسے سب بچوں سے زیادہ پیاری لگتی تھی۔ دینو کو جب سوہا پر بہت پیار آتا تو وہ اُسے فلاسفر بیٹا کہہ کر پکارتا۔

"فلاسفر بیٹا فرسٹ آئی ہے؟" دینو نے سوہا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ سوہا نے دینو کی جانب گھبرا کر دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا، کیونکہ اسی اثنا میں سوہا کا گھر آگیا تھا اور اُس کی امی دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

سوہا جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی اُس کی امی نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کون سی پوزیشن آئی بیٹا"

"امی وہ۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ فرسٹ آئی نا" امی نے اشتیاق سے کہا۔

"نہیں امی سیکنڈ۔۔۔ فرسٹ انیلا کی۔۔۔"

"کیا!۔۔۔ تم پھر سیکنڈ آئی ہو" امی کا لہجہ لمحہ بھر میں درشت ہوگیا۔

"—— —— ——"

"بولتی کیوں نہیں۔۔۔ جواب دو۔۔۔ کیوں آئی تمہاری سیکنڈ پوزیشن؟"

"مجھے کیا پتا" سوہا کی آنکھوں میں چھپی ہوئی موتیوں کی مالا دانہ دانہ ہو کر بکھرنے لگی۔

امی نے اُس کے ہاتھ سے بستہ لے کر بستر پر پھینک دیا اور اُس کی کمر پر ایک زوردار دھپ رسید کیا۔ سوہا نے رونا بند کر دیا اور کمرے کے کونے میں دُبک کر کانپنے لگی۔

"ایکٹنگ مت کرو۔۔۔ نکمی۔۔۔ کُند ذہن۔۔۔"

سوہا کے چاچا جو اتفاق سے دفتر جاتے ہوئے یہاں آگئے تھے اور سوہا کے اسکول سے آجانے کا انتظار کر رہے تھے۔ باتھ روم سے سر پر تولیہ ڈالے برآمد ہوئے۔

"ارے بھابی یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔۔۔ کیا ہوگیا؟"

"یہ تمہاری چہیتی پھر سیکنڈ پوزیشن لائی ہے۔"

"مگر آپ تو یوں چیخ رہی ہیں جیسے یہ فیل ہو گئی ہو۔"

"اے فیل ہی ہو جاتی تو اچھا تھا۔"

"بھابی خدا کا خوف کریں وہ کانپ رہی ہے۔ یہ کہہ کر چاچا نے سوہا کو گود میں اُٹھا لیا۔ سوہا چاچا سے لپٹ کر ایک بار پھر رونے لگی۔

"اسے چھوڑ دو ارشد میں آج اس کی چمڑی اُدھیڑ دوں گی۔"

"چمڑی اُدھیڑنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کل سے قصائی کی دکان کھول لیں۔" ارشد نے غصے سے کہا۔

"تمہارے اور تمہارے بھائی کے لاڈ نے ہی اسے نکمی بنایا ہے۔" بھابی نے جواباً پیر پٹختے ہوئے کہا۔

"آخر آپ چاہتی کیا ہیں اس معصوم سے؟" ارشد نے سوہا کو بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔

"میں اس کے ساتھ پچھلے پانچ سال سے دن رات ایک کیے ہوئے ہوں۔ دو دو ٹیوٹر لگوا رکھے ہیں اس کے لیے۔ مگر یہ ہے کہ سیکنڈ سے آگے ہی نہیں بڑھتی۔ بھائی رضوان کی دونوں بیٹیوں کو دیکھو اسی کی عمر کی ہیں۔ ہر سال اپنی کلاس میں فرسٹ آتی ہیں۔ کل ہی ان دونوں کا رزلٹ آیا ہے۔ اس بار بھی وہ دونوں فرسٹ آئی ہیں۔ حالانکہ نہ اُن کی ماں اُن پر توجہ دیتی ہے اور نہ ہی وہ ٹیوشن پڑھتی ہیں اور تو اور برابر والوں کی ثوبیہ بھی اس بار اپنی کلاس میں فرسٹ آئی ہے۔ اور ایک یہ ہے۔۔۔" امی نے آخری جملہ دانت کچکچاتے ہوئے مکمل کیا۔

"بھابی آپ بھی بچپن میں کبھی اپنی کلاس میں فرسٹ آئیں؟" ارشد نے یکایک اپنی بھابی کی طرف ایک چبھتا ہوا سوال اُچھال دیا۔

"ہاں۔۔۔ میں کبھی فرسٹ نہیں آئی۔ ہمیشہ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئی۔ پہلی سے لے کر بی اے تک۔۔۔ ۔۔۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ بھی میری طرح رہے۔" بھابی کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

"آپ کیوں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئیں۔ آپ کے والدین بھی سُنا ہے آپ پر بہت توجہ دیتے تھے اور آپ کے لیے دو دو ٹیوٹر لگوا کر رکھتے تھے۔" ارشد آج خلافِ معمول بحث کے موڈ میں تھا۔

"اب تم اسے اُلٹی سیدھی پٹی نہ پڑھاؤ۔" بھابی نے زچ ہو کر تنکتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا بھئی آپ کی بیٹی ہے آپ جانیں۔" ارشد نے یہ کہا اور کپڑے پہن کر بریف کیس اُٹھائے باہر نکل گیا۔

سوہا خوف کے مارے گہری نیند سو چکی تھی۔

اس دن کے بعد سے سوہا اور بھی زیادہ سنجیدہ ہو گئی اور پہلے سے بھی زیادہ چُپ چُپ رہنے لگی۔

ایک دن جب سوہا کی امّی پڑوسن کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ سوہا نے امّی کی الماری سے کتابوں کا وہ سیٹ نکال لیا جو اُسے کچھ دنوں پہلے سیکنڈ آنے پر بطورِ انعام ملا تھا۔ سوہا نے کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر "سبز پری" کی کہانی والی کتاب لے کر پڑھنے لگی۔ یکایک اُسے کچھ خیال آیا اور اُس نے دوڑ کر باہر کے دروازے کی اندر والی چٹخنی اوپر چڑھادی اور پھر آکر سبز پری کی کہانی پڑھنے لگی۔ سوہا کی امّی اس طرح کی کتابیں پڑھنے کے سخت خلاف تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ایسی کتابیں پڑھنے سے بچّے بگڑ جاتے ہیں۔

سوہا جیسے جیسے سبز پری کی کہانی پڑھتی گئی اُس کے چہرے پر چڑھی سنجیدگی کی پرتیں اُترتی گئیں اور اُن کے نیچے سے شوخ اور کھلنڈر لڑکی کا چہرہ اُبھرتا گیا۔ سوہا کو سبز پری اور اُس کی سہیلیاں بے حد پسند آئیں۔ اُسے لگا جیسے وہ ان سب کو بہت دنوں سے جانتی ہے۔ سوہا نے کتاب پر پڑھتے پڑھتے جب بے دھیانی میں پہلا قہقہہ لگایا تو قہقہہ لگاتے ہی وہ چونک کر بستر پر اُٹھ بیٹھی۔ اس وقت اگر کوئی سوہا کو دیکھ لیتا تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا۔ سوہا نے پچاس صفحات کی کہانی گھنٹہ بھر میں ختم کر دی۔ جیسے ہی کہانی ختم ہوئی گھر کی کال بیل بج اُٹھی۔ سوہا نے جلدی سے کتاب واپس الماری میں رکھ دی اور دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔

سوہا کو سبز پری کی کہانی اتنی پسند آئی کہ اُسے جب بھی موقع ملتا وہ یہ کہانی نکال کر پڑھنے لگتی۔ رفتہ رفتہ اکیلے گھر میں یہ کہانی سوہا کی سہیلی، اُس کی ہمدرد اور اس کی خوشی کا سامان بنتی چلی گئی۔ اب سوہا ہر وقت سبز پری اور اُس کے عجیب و غریب دیس کوہ قاف کے بارے میں سوچتی رہتی۔ کبھی کبھی وہ سوچتے سوچتے مُسکرانے لگتی اور اُسے محسوس ہوتا کہ اُس کے بازوؤں پر سبز پری کی طرح پَر نکلنے والے ہیں۔ اس خیال سے اُسے بیک وقت خوف اور خوشی محسوس ہوتی۔ البتہ خوشی کا احساس خوف کے احساس سے زیادہ شدید ہوتا۔ سوہا ہر رات سونے سے پہلے آنکھیں بند کر کے پوری کہانی کو ذہن میں دُہراتی۔ وہ سبز پری کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہیروں کے تخت پر بیٹھ کر سفر کرتے اور کوہ قاف کو ہری بھری وادی میں آنکھ مچولی کھیلتے دیکھتی اور کبھی کبھی اُن کے ساتھ آنکھ مچولی کے کھیل میں شریک ہو جاتی۔ لیکن کہانی کا وہ حصّہ جس میں ایک خونخوار دیو سبز پری کو اُٹھا کر لے جاتا ہے اور قید کر لیتا ہے۔ اُس کے ذہن میں جب بھی آتا وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔ اور اپنے برابر میں لیٹی ہوئی امی کو غور سے دیکھنے لگتی۔

"اللہ میاں اس کہانی سے دیو کو نکال دے" وہ بڑبڑاتی اور پھر اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتیں۔

سوہا نے جب سے سبز پری کی کہانی پڑھنی شروع کی تھی۔ اُس کی صحت بہتر ہونے لگی تھی۔ اُس کے گالوں اور ہونٹوں میں گلابی پن بڑھنے لگا تھا۔ اُس کی بہتر ہوتی ہوئی صحت کے بارے میں اُس کی امّی کا خیال تھا کہ یہ صبح و شام باقاعدگی سے دُودھ پینے اور سیب کھانے کا کمال ہے۔

سوہا اور سبز پری کی دوستی اب چھٹے ماہ میں داخل ہو چکی تھی ۔ کہتے ہیں کہ دوستی اپنی انتہا کو چھونے لگے تو ٹوٹ جاتی ہے۔

ممکن ہے یہ بات جھوٹ ہو لیکن سوہا اور سبز پری کی کہانی کے ساتھ یہی ہوا ۔

ایک دن جب سوہا کی امّی شاپنگ کے لیے باہر گئی ہوئی تھیں تو سوہا بھول سے گھر کے دروازے کی چٹخنی لگائے بغیر کہانی پڑھنے بیٹھ گئی ۔ ابھی کہانی آدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ امّی آ پہنچیں ۔ سوہا کہانی میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اُسے امّی کے آنے کا پتا ہی نہ چلا ۔ امّی کمرے میں داخل ہوئیں تو اُن کی نظر کہانی کے ٹائٹل پر پڑ گئی ۔

"اُف میرے خدا ۔۔۔ تم میری غیر موجودگی میں یہ الاّ بلا پڑھتی رہتی ہو ۔۔۔ میں بھی تو کہوں اب تم میرے ساتھ باہر جانے کے لیے ضد کیوں نہیں کرتیں ۔ اور تمہیں گھر میں اکیلے رہتے ہوئے ڈر کیوں نہیں لگتا" امّی کی یوں اچانک آمد نے سوہا کے ہوش اُڑا دیے ۔ وہ جس حالت میں کہانی پڑھ رہی تھی اُسی حالت میں رہ گئی ۔

امّی نے جھپٹ کر اُس کے ہاتھ سے کہانی کی کتاب چھین لی ۔ اتفاق سے اُس وقت ایک پڑوسن آ گئی اور سوہا پٹنے سے بال بال بچ گئی ۔ پڑوسن کے جاتے ہی امّی نے سبز پری اور دوسری کہانیوں کی کتابیں الماری سے نکال کر جلا ڈالیں ۔

اس واقعہ کے ٹھیک ایک ہفتے بعد ایک رات کو سوہا نے خلافِ معمول اپنی امّی سے آئس کریم کھانے کی ضد کی ۔ امّی نے خلافِ معمول اُسے آئس کریم منگا کر دے دی ۔ سوہا آئس کریم کھا کر تھوڑی دیر بعد ہی گہری نیند سو گئی ۔ صبح جب اُس کی امّی نے اسکول کے لیے اُسے جگانے کی غرض سے اُس کا ہاتھ چھُوا تو اُن کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا ۔ سوہا کا ہاتھ شدّتِ بخار سے تپ رہا تھا ۔ انہوں نے فوراً ہی فون کر کے فیملی ڈاکٹر اور سوہا کے چاچا کو بُلا لیا ۔

ڈاکٹر نے تفصیلی معائنے کے بعد نمونیہ کا خدشہ ظاہر کیا ' تو امّی نے رات کی آئس کریم کو اس کا ذمّے دار سمجھتے ہوئے اپنا سر پیٹ لیا ۔ رات تک سوہا کی طبیعت اور خراب ہو گئی ۔ سوہا کے چاچا نے اسلام آباد فون کر کے اُس کے ابّو کو فوراً آنے کے لیے کہا ۔ امّی اور چاچا رات بھر سوہا کے سرہانے بیٹھے رہے ۔ سوہا مکمل طور پر بے ہوشی کی حالت میں تھی ۔

آج سوہا کو بیمار پڑے ایک ہفتہ ہو چکا تھا ۔ اس عرصے کے دوران شہر کے تمام ماہر ڈاکٹروں کے ہاں لے جا کر سوہا کو دکھایا جا چکا تھا ۔ لیکن کوئی بھی ابھی تک سوہا کی بیماری کی نوعیت درست طور پر متعیّن نہیں کر سکا تھا ۔ امّی ابّو اپنی بیٹی اور چاچا اپنی بھتیجی کی حالت پر ہر وقت روتے رہتے دُعائیں کرتے رہتے ۔ بیماری کی نویں رات کو اچانک سوہا پر فالج کا حملہ ہوا ۔ فالج کا زیادہ اثر سوہا کے ہاتھوں اور پیروں پر تھا ۔ سوہا کے متعلقین پر اس رات قیامت گذر گئی ۔ انہیں تو شاید اس کا پتا ہی نہ چلتا اگر ڈاکٹر سوہا کے ہاتھوں ' پیروں کو چیک نہ کرتا ۔

فالج کے حملے کو ابھی چند گھنٹے ہی گزرے تھے کہ سوہا کی ریشم ایسی پلکیں لرزنے لگیں اور تھوڑی دیر بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس پر ابّو اور چاچا مارے خوشی کے اُچھل پڑے۔

"آنکھیں کھولو میری جان... بولو میری جان" امّی سوہا کے منہ کو بے تحاشہ چُومتے ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ روتے ہوئے ہنستے ہوئے بُڑبڑاتی ہوئی بولنے لگیں، لیکن سوہا گم سُم لیٹی رہی۔ ابّو، چاچا سب نے لاکھ کوشش کی مگر وہ ایک لفظ نہ بولی۔ شاید بول نہ سکی۔

اس کے بعد ایک سال تک سوہا کا باقاعدہ علاج ہوتا رہا۔ تب کہیں جاکر اُس کے فالج زدہ ہاتھ پیر نارمل حالت میں آسکے، لیکن سوہا اس پچھلے ایک سال میں ایک لفظ بھی نہ بولی تھی۔ سوہا اکثر بیٹھے بیٹھے چونک جاتی اور پھر پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔ جیسے وہ کسی چیز کو تلاش کر رہی ہو۔ امّی سوہا کی اس حالت کا ذمّے دار اُس رات والی آئس کریم کو ٹھہرائیں اور اپنے آپ کو کوستیں۔ ابّو سوچتے کہ سوہا اُن سے دُور رہ کر بیمار پڑی ہے، آئس کریم تو محض ایک بہانہ ہے۔ چاچا اکثر اپنی بھابی کے بارے میں منفی انداز سے سوچتے۔

دو سال کے طویل وقفے کے بعد ایک روز سوہا شام کے وقت ٹی وی پر بچّوں کے لیے شروع ہونے والا نیا پروگرام الف لیلہ دیکھ رہی تھی۔ اُس کی امّی اُس کے بستر کے پاس ہی زمین پر بیٹھی ٹب کے پانی میں کپڑوں کو دینے کے لیے نیل ملا رہی تھیں کہ سوہا ٹی وی اسکرین پہ نمودار ہونے والی ایک پری کو دیکھ کر زور سے چیخی۔

"امّی میری پری"

امّی نے چونک کر پہلے سوہا کی جانب اور پھر ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا ایک لمحے میں پچھلے دو سال کا ایک ایک منظر اُن کے ذہن میں سائیں سائیں کرکے گزر گیا۔ اُنھیں محسوس ہوا کہ وہ کھولتے ہوئے لاوے میں نیل گھول رہی ہیں۔

تحریری مباحثہ ــــــ اس ایوان کی رائے میں

"طالبات طلبہ سے زیادہ ذہین ہیں"

گزشتہ شمارے میں تحریری مباحثہ میں شرکت کی آخری تاریخ غلطی سے ۳۰ اکتوبر کے بجائے ۳۰ ستمبر شائع ہوگئی تھی اب اس تاریخ میں نہ صرف تصحیح بلکہ توسیع بھی کی جارہی ہے۔ اب تحریری مباحثہ میں شرکت کی آخری تاریخ ۱۰ نومبر ۸۸ء ہے۔ دو بہترین تحریروں کو جنوری ۸۹ء کے خاص شمارے میں شائع کیا جائے گا۔ ادارہ

بچّوں کا گیت

سیّد فیضان عارف

ہم ہیں دیس کے پیارے بچے روشن چاند ستارے بچے

ہم ہی قوم کا مستقبل ہیں
ہم ہی پاکستان کا دل ہیں

ہم ہیں آنکھ کے تارے بچے روشن چاند ستارے بچے

ہم ہیں اس گلشن کی کلیاں
ہم سے روشن کوچے گلیاں

ہم ہیں نور کے دھارے بچے روشن چاند ستارے بچے

ہم قائد کا مان بنیں گے
پاکستان کی شان بنیں گے

مل کر گائیں سارے بچے روشن چاند ستارے بچے

ہم اقبال کی آن بنیں گے
ہم ٹیپو سلطان بنیں گے

ہم ہیں راج دلارے بچے روشن چاند ستارے بچے

بچے ہیں پُرعزم جواں ہیں
آزادی کے نغمہ خواں ہیں

پاک وطن کے سارے بچے روشن چاند ستارے بچے

کرکٹ کی دنیا

علی حسن ساجد

جہاں ریکارڈ بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔

- ایک اوور میں سب سے زیادہ رنز بنانے والا شخص "سوبرز" ہے۔ جس نے چھ گیندوں پر چھ چھکے لگائے۔
- کسی ٹیسٹ میچ میں سب سے زیادہ وکٹیں حاصل کرنے والا شخص "جم لیکر" ہے۔ جس نے دونوں اننگز میں مجموعی طور پر ۱۹ وکٹیں حاصل کیں۔
- تیز ترین بولر "جی براؤن" کی ایک تیز گیند جسے نہ بیٹسمین کھیل سکا۔ اور نہ ہی وکٹ کیپر پکڑ سکا۔ باؤنڈری لائن پر گشت کرتے ہوئے ایک کتے کے سر پر لگی اور وہ کتا وہیں مر گیا۔
- ممتاز کرکٹر شاہد محمود پاکستان کے وہ واحد بولر ہیں، جنہوں نے فرسٹ کلاس کرکٹ کی ایک اننگ میں دس کی دس وکٹیں حاصل کیں اور سب کو حیرت میں ڈال دیا۔
- پہلی ٹیسٹ سنچری نذر محمدؒ نے ۱۹۵۴ء میں لکھنؤ میں بنائی اور پاکستان کی طرف سے ٹیسٹ کرکٹ میں پہلا وکٹ حاصل کرنے کا اعزاز خان محمدؒ کے حصے میں آیا۔ اور ممتاز کرکٹر حنیف محمدؒ نے اپنا سب سے زیادہ ٹسٹ اسکور ۴۳۷ رنز ۹۹۹ منٹ میں مکمل کیا تھا۔
- نیوزی لینڈ کے ایک ٹیسٹ کرکٹر نے ایک ہی دن میں پندرہ چھکے لگا کر ایک ریکارڈ قائم کیا تھا جو آج بھی برقرار ہے۔
- ٹیسٹ کرکٹر امیر الٰہی، گل محمدؒ اور کاردار ایسے کھلاڑی ہیں جو پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کی جانب سے ٹیسٹ میچ کھیل چکے ہیں۔
- ۲۱ جولائی ۱۹۵۶ء کو اولڈ ٹریفرڈ کے مقام پر انگلستان کے بولر "جم لیکر" نے آسٹریلیا کے خلاف ایک میچ میں ۱۹ وکٹیں لے کر اس دن کو کرکٹ کی تاریخ میں ایک تاریخ ساز دن بنا دیا۔
- "گارفیلڈ سوبرز" وہ کھلاڑی ہیں، جنہوں نے فرسٹ کلاس کرکٹ میں اوور کی ہر گیند پر چھکا مارا۔ اور ایک ریکارڈ قائم کیا۔

○ پاکستان کے ٹیسٹ کرکٹرز انتخاب عالم وہ ممتاز کرکٹر ہیں جنہوں نے اپنے پہلے ہی ٹیسٹ میچ کے پہلے روز پہلی ہی گیند پر پہلا ٹیسٹ وکٹ حاصل کیا تھا۔

○ پاکستان کے ٹیسٹ کرکٹر امتیاز احمد وہ کھلاڑی ہیں جنہوں نے ایک ٹیسٹ میچ میں پہلی اننگ میں سنچری بنا کر شائقین کی بھرپور توجہ حاصل کرلی اور دوسری اننگ میں لوگ شدّت سے امتیاز احمد کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ اپنی باری پر بیٹنگ کرنے آئے تو شائقین کو حیرت کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ صفر پر ہی آؤٹ ہوگئے۔

○ کرکٹ کی دنیا میں "قائد اعظم ٹرافی" ۱۹۵۳-۵۴ء میں شروع ہوئی اور اسے سب سے پہلے بھاولپور ٹیم نے جیتا۔

○ اب سے کچھ عرصے پہلے تک دنیا کا سب سے زیادہ کیچ پکڑنے والا شخص "فرینک وولی" تھا۔ جس نے ایک ہزار گیارہ کیچ پکڑے اور دنیا کا سب سے زیادہ ایک اننگ میں چھکّے مارنے والا شخص "جورن ریڈ" ہے جس نے ایک اننگ میں ۱۵ چھکّے مارے۔

○ "چائنامین" "گگلی" اور "آرمر" یہ کھلاڑیوں کے نام نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف انداز سے گیند پھینکنے کے نام ہیں وہ کچھ یوں کہ جب کوئی بائیں ہاتھ سے بولنگ کرنے والا کھلاڑی کسی دائیں ہاتھ سے بیٹنگ کرنے والے کھلاڑی کو لیگ بریک کے بجائے آف بریک گیند کھلادے تو اس گیند کو "چائنامین" کہتے ہیں۔ گگلی سیدھے ہاتھ سے لیگ بریک کرانے والے بولر کی اس گیند کو کہتے ہیں جو آف بریک کے انداز میں پھینکی جائے "آرمر" کسی بھی ایسی گیند کو کہا جاتا ہے، جس میں بولر اپنی کلائی یا انگلیوں کی حرکت کو استعمال نہ کرے بلکہ بازو کے مکمل ایکشن کے ساتھ گیند بیٹسمین کی طرف روانہ کردے۔ عام طور پر دائیں ہاتھ سے پھینکی ہوئی ایسی گیند آؤٹ سوئنگ ہوجاتی ہے۔ اسی طرح اُلٹے ہاتھ سے نکلی ہوئی ایسی گیند اِن سوئنگ ہوجاتی ہے۔

○ اگر ایک کھلاڑی پہلی اننگ میں دو سو رنز بنائے اور دوسری میں ایک سو تو اس کھلاڑی کے نام پر تین سنچریوں کی بجائے صرف دو سنچریاں لکھی جائیں گی کیونکہ ریکارڈ بک میں ایسی اننگز کو ایک سے زائد اسکور کی سنچری میں شامل کیا جاتا ہے۔ چاہے کھلاڑی نے چار سو رنز بنائے ہوں۔ اسے چار سنچریاں نہیں کہا کہا جائے گا چونکہ یہ رنز ایک ہی اننگز کے دوران بنائے گئے ہوں۔ اس لئے "ایک سو سے زائد اسکور" کی فہرست میں اسے ایک ہی تصوّر کیا جائے گا۔

○ کرکٹ کی دنیا میں یہ اصول بڑا دلچسپ ہے کہ اگر ایک بیٹسمین اس طرح گیند کھیلے کہ وہ اس کے بلّے کا کنارہ لے کر اس کی وکٹوں کی طرف آرہی ہو اور وہ اُسے وکٹوں میں لگنے سے پہلے پاؤں سے روک دے تو

ایسی صورت میں بیٹسمین کو آؤٹ نہیں کیا جاتا ۔ بلکہ وہ ناٹ آؤٹ رہ کر اپنا کھیل جاری رکھتا ہے۔

○ اگر آپ ٹیسٹ ایمپائر بننا چاہتے ہیں تو گھبرایئے نہیں! کیوں کہ ٹیسٹ ایمپائر بننے کوئی ڈگری نہیں لینا پڑتی۔ البتہ امتحان ضرور پاس کرنا پڑتا ہے۔ اور ٹیسٹ ایمپائر بننے کے لئے تجربہ ضروری ہے۔

○ گرہاکی کی طرح کرکٹ کے لئے بھی آسٹرو ٹرف استعمال کی جائے تو وہ کرکٹ کے لئے نقصان دہ ہے کیوں کہ ہاکی کی طرح کرکٹ کے بھی مختلف تقاضے ہوتے ہیں۔ آسٹرو ٹرف پر عموماً ایک خاص رفتار سے کھیل ہو سکتا ہے لیکن کرکٹ میں کھیل کا مزاج لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔

○ کرکٹ میں دو مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ٹیسٹ میچ میں دو حقیقی بھائیوں نے حصہ لیا اور دونوں نے سنچریاں بنائیں۔ آسٹریلیا کے ایان اور گریگ چیپل دونوں بھائی تھے۔ ایک ٹیسٹ کی دونوں اننگز میں دونوں

بھائیوں نے سنچریاں بنائیں اور ۷۴-۱۹۷۳ میں نیوزی لینڈ کے خلاف ویلنگٹن کے مقام پر ایان چیپل نے ۱۴۵ اور ۱۳۱ اور گریگ چیپل نے ۱۴۷ اور ۱۳۳ رنز بنائے۔ پاکستان کے صادق محمدؒ اور ان کے حقیقی بھائی مشتاق محمدؒ نے بھی حیدرآباد میں نیوزی لینڈ ہی کے خلاف کھیلتے ہوئے ایک ہی اننگز میں سنچریاں بنائیں۔

○ پاکستان کی طرف سے ایک میچ میں تین حقیقی بھائیوں نے حصہ لیا اور وہ تھے، حنیف محمدؒ، مشتاق محمدؒ اور صادق محمد۔ یہ ٹیسٹ میچ نیوزی لینڈ کے خلاف ۷۰-۱۹۶۹ء میں کراچی میں کھیلا گیا تھا۔ حنیف محمدؒ کا اسکور دونوں اننگز میں ۲۲ اور ۳۵، صادق محمدؒ کا ۶۹ اور ۳۷ اور مشتاق محمدؒ کا اسکور تھا ۱۴ اور ۱۹۔

○ انڈیا کا ٹیسٹ کرکٹر بھگوت چندر شیکھر دنیا کا وہ کھلاڑی ہے جو سب سے زیادہ صفر پر آؤٹ ہوا۔ بھگوت چندر ۵۸ ٹیسٹ میچوں میں اسی اننگز میں ۲۶ مرتبہ کوئی رن بنائے بغیر آؤٹ ہوا۔

تاریخ ساز لوگ

اس ماہ کے بڑے لوگ جو زندہ رہیں گے

علّامہ اقبالؒ

کلاس میں سارے طالب علم موجود تھے اور اُستاد ان کو پڑھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک اور طالب علم نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ استاد نے اس لڑکے کو اپنے پاس بلا کر سخت لہجے میں کہا:

تم اتنی دیر سے کیوں آئے؟" لڑکے نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

"جناب اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے"۔ لڑکے کا یہ معنی خیز جملہ سُن کر اُستاد حیران رہ گئے۔ یہ تھے ہمارے شاعرِ مشرق علّامہ محمد اقبال۔ جنہوں نے پہلی مرتبہ مسلمانانِ برِصغیر کے لیے ایک اسلامی ریاست کا خواب دیکھا۔ آپ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ کے محلّہ بازارِ چوڑی گراں میں پیدا ہوئے۔ مرے کالج سیالکوٹ میں انہوں نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ جہاں اُن کے اُستاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن تھے۔ انہوں نے علّامہ اقبال میں عربی، فارسی اور اُردو کا صحیح ذوق پیدا کیا۔ بی اے اور ایم اے کا امتحان علّامہ اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے امتیازی نمبروں میں پاس کیا۔ پھر انہوں نے برطانیہ سے بیرسٹری کی ڈگری لی۔ بعد میں انہوں نے جرمنی سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کیا۔ ۱۹۲۲ء میں ان کو حکومتِ برطانیہ نے "سر" کا خطاب دیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے زبان و ادب کو مالا مال کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اقبال کی شاعری میں عزم، ارادہ، جہدِ مسلسل، امید اور فتح کا تصور ملتا ہے۔ شاعری پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ علّامہ اقبال نے اسلام کا پیغام پیش کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ چاہتے تھے۔ انہوں نے جو خواب دیکھا اس میں اپنی شاعری کے سارے رنگ بھر دیے۔ قوم نے ان کو "ترجمانِ حقیقت" اور "حکیم الامّت" کا خطاب دیا۔ اپنے خواب کے شرمندۂ تعبیر ہوتے سے پہلے ہی علّامہ اقبالؒ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بانگِ درا۔ بالِ جبریل۔ ضربِ کلیم۔ اسرارِ خودی۔ رموزِ

نیخودی ۔ پیامِ مشرق ۔ زبورِ عجم اور جاوید نامہ اقبال کے مجموعۂ کلام ہیں ۔ آپ کا مزار لاہور میں بادشاہی مسجد کے بڑے دروازے کے نزدیک واقع ہے ۔

مولانا ظفر علی خان

مولانا ظفر علی خان ایک قادر الکلام شاعر، بلند پایہ صحافی اور اہم رہنما کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور تحریکاتِ ملّی آپ کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں مشہور نعت "وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں" آپ ہی کی تخلیق ہے۔ آپ ضلع سیالکوٹ کے گاؤں کوٹ مہر تھ میں ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکریٹری ہو گئے۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن میں مترجم کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ اور ترقی کرتے کرتے ریاستی محکمۂ داخلہ کے سیکریٹری بن گئے۔ اُسی زمانے میں آپ نے علامہ شبلی نعمانی کی معرکۃ الآرا تصنیف "الفاروق" کو انگریزی میں منتقل کیا۔ انگریزی زبانوں کے کئی شاہکاروں کے اردو ترجمے کیے۔ پھر لارڈ کرزن کی کتاب "گارڈن آف پرشیا" کو خیابانِ فارس کے روپ میں پیش کیا اور "جنگِ روس و جاپان" کے عنوان سے ایک طبعزاد منظوم ڈرامہ بھی لکھا۔

۱۹۰۲ء میں حیدر آباد دکن میں ایک چھوٹا سا ماہنامہ "افسانہ" کے عنوان سے جاری کر کے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ اگلے سال ان کی کوششوں سے ایک اور علمی و ادبی ماہنامہ "دکن ریویو" کے نام سے منظرِ عام پر آیا لیکن ان کی حقیقی صلاحیتوں سے اُس وقت آگہی ہوئی جب انھوں نے اپنے والد مولوی سراج الدین احمد کی وفات پر ہفت روزہ "زمیندار" کی ادارت سنبھالی اور اُسے برِصغیر کا سب سے کثیر الاشاعت اُردو اخبار بنا دیا۔ انھوں نے ۱۹۱۷ء میں ایک اور علمی جریدہ "ستارۂ صبح" کے عنوان سے بھی جاری کیا تھا۔ مولانا ظفر علی خان اتحاد بین المسلمین کے داعی اور برِصغیر کے ایک اہم قومی رہنما بھی تھے۔ انھوں نے تحریکِ خلافت میں پُرجوش حصّہ لیا۔ اور کئی بار حوالۂ زنداں ہوئے۔ مختلف وفود میں برِصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کا شرف حاصل کیا۔ مسجد شہید گنج کے مسئلے پر مسلمانوں کی بے باک ترجمانی کی۔ مجلس اتحاد ملّت قائم کی جسے بعد میں آل انڈیا مسلم لیگ میں ضم کر دیا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۶ء تک پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے ۱۹۴۶ء میں مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ آپ نے ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو ۸۳ برس کی عُمر میں انتقال کیا۔

مولانا محمود الحسن

۳۰ نومبر ۱۹۳۰ء

مولانا محمود الحسن برِصغیر کے مشہور عالمِ دین اور تحریکِ آزادی کے نامور رہنما تھے۔ جو "شیخ الہند" اور اسیرِ مالٹا کے خطاب سے مشہور ہوئے۔ جب ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دیوبند میں مشہور دینی مدرسہ قائم کیا تو اس کا پہلے طالبعلم

بننے کا شرف مولانا محمود الحسن کو حاصل ہوا۔ دیوبند سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ وہاں اُستاد مقرر کر دیے گئے۔۔۔
۱۸۸۸ء سے اپنی وفات تک تقریباً ۳۳ برس آپ نے اس مشہور دینی درس گاہ کے صدر مدرّس کے فرائض انجام دیے
۱۹۰۹ء میں آپ نے جمعیت الانصار نامی تنظیم قائم کی جس کے تحت آپ نے علی گڑھ کالج کی انتظامیہ سے ایک معاہدہ کیا کہ علی گڑھ کے طلبہ دیوبند میں اور دیوبند کے طلبہ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر سکیں۔

آپ کی سیاسی خدمات بھی ہماری تاریخ کا ایک اہم حصّہ ہیں۔ آپ انگریزی حکومت اور اُن کے طرزِ معاشرت کے کٹّر ناقد اور مخالف تھے۔ ۱۹۱۵ء میں آپ نے انگریزوں کو برِّصغیر سے نکالنے کے لیے ترکی کی مدد حاصل کرنے کے لیے حجاز کا دورہ کیا۔ اور حجاز کے گورنر غالب پاشا اور وزیرِ جنگ انور پاشا سے ملاقات کی۔ آپ نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے مثالی جدّوجہد کی۔ اور رُومال پر خفیہ پیغامات بھیج کر دنیا کی تحاریکِ آزادی میں ایک نئی روایت قائم کی۔ جو "تحریک ریشمی رومال" کے نام سے مشہور ہوئی۔ برطانوی حکومت کے حکم پر مکّہ کے شریف حسین نے آپ کو گرفتار کیا اور آپ کو مالٹا بھیج دیا گیا۔ جہاں آپ نے تین سال سے زیادہ عرصہ گزارا۔ ۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو آپ رہا ہو کر بمبئی پہنچے اس زمانے میں تحریکِ خلافت اپنے عروج پر تھی۔ آپ نے فوراً ہی انگریزوں سے عدم تعاون کی حمایت میں فتویٰ جاری کیا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت آپ ہی نے کی۔ ۳۰ نومبر ۱۹۳۰ء کو آپ نے تقریباً ستّر برس کی عمر میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ قرآنِ مجید کے ترجمے سمیت آپ نے عربی میں بے شمار کُتب تصنیف کیں۔
آپ کے شاگردوں میں مولانا اشرف علی تھانوی، علّامہ انور شاہ کشمیری، مولانا حسین احمد مدنی اور علّامہ شبیر احمد عثمانی زیادہ مشہور ہوئے ہیں۔

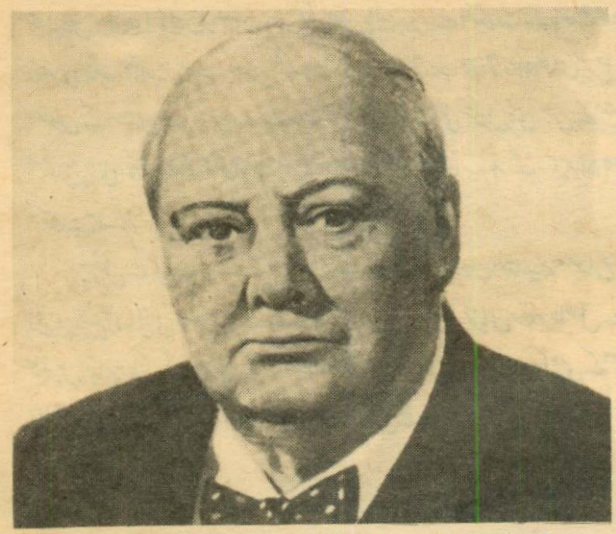

سر ونسٹن چرچل

ونسٹن لیونارڈ اسپنسر چرچل

Winston Leonard SPencer Churchil)

Hurchill ۳۰ نومبر ۱۸۷۴ء کو Blenheim Palace میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لارڈ رنڈولف چرچل RandolPh Churchill ایک برطانوی سیاستدان تھے۔ چرچل نے عام اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی بجائے فوجی تعلیم وتربیت کو ترجیح دی۔ چنانچہ انھوں نے ہیرو ـــــــ اور سینڈ ھرسٹ ـــــ جیسے مشہور اداروں میں تعلیم پائی۔ ۱۸۹۵ء میں وہ برطانوی فوج میں شامل ہو گئے۔ اسی سال ہسپانوی فوج کے ساتھ کیوبا میں خدمات انجام دیں اس کے بعد ہندوستان میں شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں اور پھر جنوبی افریقہ میں بھی متعین رہے۔ جہاں انھوں نے جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ جنگ بوئر Boer Warr میں گرفتار ہوئے مگر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۹۰۰ء میں وہ پہلی مرتبہ کنزرویٹو Conservative پارٹی کی جانب سے پارلیمنٹ ممبر منتخب ہوئے لیکن ۱۹۰۴ء میں انھوں نے لبرل پارٹی Liberal Party میں شمولیت اختیار کر لی۔ پہلے بورڈ آف ٹریڈ کے صدر ہوئے (۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۰ء)۔ پھر ہوم سکریٹری (۱۹۱۰ء) اور اس کے بعد اکتوبر ۱۹۱۱ء سے مئی ۱۹۱۵ء تک بحریہ میں First Lord Of Admiralty کے عہدے پر فائز رہے۔ جہاں انھوں نے بحری افواج کو پہلی جنگِ عظیم کے لیے بھرپور طریقے سے تیار کیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۲۳ء میں چرچل نے دوبارہ کنزرویٹو Conservative پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور کئی برس تک Chancellor Chancellor Of Exchequer کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے وزیرِ اعظم چیمبرلین Chamberlain کی بعض پالیسیوں سے اختلاف کے باعث کابینہ سے استعفیٰ دے دیا۔۔۔ دوسری جنگِ عظیم میں جب برطانیہ شکست کے بہت قریب تھا تو ۱۹۴۰ء میں چرچل وزیرِ اعظم منتخب ہو گئے۔ انھوں نے اسٹالن اور روزویلٹ کے ساتھ مل کر نئی حکمتِ عملی تشکیل دی۔ جس کے نتیجے میں جرمنی کو شکست اُٹھانی پڑی۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں وہ وزارتِ عظمیٰ کا انتخاب ہار گئے۔ تاہم ۱۹۵۱ء میں وہ دوبارہ وزیرِ اعظم منتخب ہو گئے۔ اور ۱۹۵۵ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

چرچل نے عملی سیاست کے علاوہ ادب کے مختلف شعبوں انشائیے، سوانح عمریاں، ناول اور تاریخ جنگ وغیرہ پر طبع آزمائی کی۔ انگریزی ادب کے نثر نگاروں میں انھیں نمایاں مقام حاصل ہے۔ ۱۹۵۳ء میں انھیں ادب کا نوبل انعام عطا کیا گیا۔ چرچل ایک اچھے مصور بھی تھے۔ اس کے علاوہ وکٹری کے "V" کا نشان اور ان کا سگار عالمگیر شہرت کے حامل ہیں۔ ان کا انتقال ۲۴ جنوری ۱۹۶۵ء کو ہوا۔

سعیدہ نازش

چھپا ہوا خزانہ

نام تو اس کا کچھ اور ہی تھا۔ مگر سستی اور کاہلی نے جہاں اس کی شخصیت کی مٹی پلید کی وہیں اس کا نام بھی بگڑ کر رہ گیا۔ سب ہی اسے سوتے خان کہہ کر پکارنے لگے جس کی اصل وجہ اس کا ہر وقت اونگھتے رہنا تھا۔

ایک دن جبکہ سردی شدید تھی اس کی ماں کو نمونیہ ہوگیا۔ ماں نے اسے بہت سمجھایا۔ "بیٹا دیکھ کھیل کود کے چکر میں تونے پڑھا نہیں۔ کاش تو پڑھ لکھ لیتا۔ کتنا ارمان تھا مجھے کہ میرا بیٹا میرا لعل پڑھ لکھ کر بابو بنے۔ مگر تو نے اپنے کھیل کود میں پرواہ ہی نہ کی۔ دیکھ بیٹا اب بھی وقت ہے تو کوئی کام سیکھ لے۔ محنت کیا کر۔

مگر ماں میں محنت نہیں کرسکتا، نہیں ہوتی مجھ سے محنت اور پھر صحت کونسی اچھی رہتی ہے میری۔ وہ جھنجھلایا۔ محنت کر کے کیا مجھے مرنا ہے۔

دیکھ بیٹا۔ محنت میں تو زندگی ہے ہمارے نبیؐ نے فرمایا تھا محنت میں عظمت ہے۔

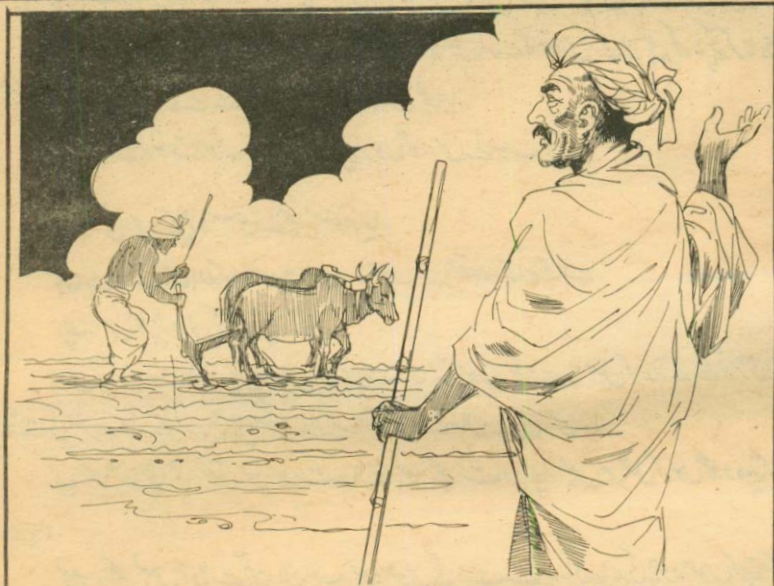

وہ محنت و مشقت کرنے کے بجائے کسی جن کو قابو میں کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

ماں محنت میں کیا رکھا ہے۔ میں تو کسی طرح اسفل جن کو قابو کروں گا۔ پھر وہ محل بنائے گا اور میں اس میں شہزادہ کامران کی طرح رہوں گا۔ جیسا کہ اسفل جن والی کتاب میں ہے۔

ارے بیٹا تجھے کیسے سمجھاؤں۔ دیکھ بیٹا جنوں کو کیا پڑی جو اپنی چھوڑ کر ہماری نبیڑیں گے۔ یہ جو تیری کاہلی ہے نا یہ ہی تیرا اسفل جن ہے۔ جب تک تو محنت نہیں کرے گا تیری حالت نہیں بدلنے کی۔ جس دن تو کاہلی چھوڑ دے گا جان لے کہ اسفل جن تیرے قابو میں ہو گا۔ ماں نے اسے سمجھایا۔

کچھ بھی کہہ ماں مجھ سے تو محنت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ صاف جواب ہے میرا۔

اچھا بیٹا تیری مرضی تو جیسا چاہے کر ہمارا کام تجھے سمجھانا ہے سمجھا دیا۔ اللہ تجھے خوش رکھے۔

ماں کو کھانسی آنے لگی۔

ماں بیمار ہو گئی تو کمانے کا آسرا بھی نہ رہا۔ وہ تو کچھ گھروں میں کام کر کے پیسے اور کھانا لے ہی آتی تھی۔ سوتے خان کو سب ہی نے سمجھایا۔ ارے بے غیرت نہ بن۔ دیکھ تو اب چھوٹا بچہ نہیں رہا اپنے سولہ برس کے بدن کو دیکھ اٹھارہ برس کا لگتا ہے۔ ماں کے ٹکڑوں پر پڑا ہے۔ گھر میں فاقے ہو رہے ہیں پھر بھی میاں شہزادے کو اسفل جن یاد ہے۔ یہ جو تین کلاسیں تو نے پڑھ لیں نا یہ بھی نہ پڑھتا تاکہ تو جن بھوتوں کے قصے پڑھ پڑھ کر بگڑتا بھی نہیں۔ ارے بچے تو جن کو حاصل کرے گا تو اس کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا نا۔ اس کے پڑوسی نے اسے ڈانٹا اور پھر پیار سے بھی سمجھایا۔

اسفل جن کو تو قابو کرنے کے لئے سب کچھ کروں گا۔ اس نے جواب دیا۔

کیا واقعی اس کے پڑوسی نے پھر معلوم کیا۔

ہاں ہاں واقعی بھئی اور کیا جھوٹ بول رہا ہوں۔ میرا مقصد ہی یہ ہی ہے۔

اچھا۔ اس کا پڑوسی کچھ سوچنے لگا۔

کاش تم کو معلوم ہوتا کہ میں اسفل جن کا پتہ جانتا ہوں مگر اسے حاصل کرنے کے لئے تو بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ وہ بڑبڑایا مگر انداز ایسا تھا کہ سوتے خان نے بھی سن لیا۔

کیا۔ کیا کہا چچا تم اسفل جن کا پتہ جانتے ہو۔ مجھے بتا دو چچا۔ میں ہر عمل کروں گا۔ وہ بیتابی سے بولا۔

نہیں ابھی نہیں آج سے تین دن بعد چودھویں کی رات ہے یہ راز چاند کی چودھویں کو بتا سکتا ہوں کسی کو۔ اس کے پڑوسی نے لاپرواہی سے کہا اور آگے چل پڑا۔

سوتے خان سے تین دن گزارنے مشکل ہو گئے۔ ماں تو کسی نہ کسی طرح ٹھیک ہو ہی گئی۔ کمزور بہت ہو گئی تھی۔ مگر سوتے خان کو اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی وہ تو اسفل جن کو قابو کر کے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا سوچ رہا تھا۔

ٹھیک تین دن بعد وہ پڑوسی کے دروازے پر تھا۔ میں اندر آجاؤں چاچا۔

ہاں ہاں آؤ آؤ میاں سوتے خان میں ابھی ابھی عمل سے فارغ ہوا ہوں۔ دیکھو میاں بات یہاں بتانے کی نہیں ہے۔ دراصل یہاں سے کچھ فاصلے پر تمہاری کچھ زمین ہے وہیں اس کا سراغ ملے گا۔ میرے علم میں آیا ہے کہ وہ پہلے جس کی قید میں تھا اس نے اس طرف اسے کسی جگہ ایک بوتل میں بند کر کے زمین میں دفن کر دیا ہے۔ اب تم اسے ڈھونڈ نکالو آزاد کرالو گے تو وہ تمہارا غلام ہو جائے گا۔ اگر تمہاری زمین ہی میں نکل آیا تو خوش قسمتی کے کیا کہنے۔

اچھا، چلو چچا ابھی چلو۔

ہاں ہاں چلتے ہیں میں اپنی چیزیں لے لوں جن کی مدد سے معلوم کر سکوں۔ کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے ایک تھیلا اٹھایا اور دونوں چل پڑے۔

زمینوں پر پہنچ کر وہ ایک پیالہ، لوٹا اور لوبان نکالا۔ لوٹے کو زمین پر رکھا اور پیالہ اس پر رکھ کر سننے لگا۔

سوتے خان بڑی حیرت سے اس کو عمل کرتے دیکھ رہا تھا۔ بے تابی اس کے چہرے سے ٹپکی پڑ رہی تھی۔

دیکھو بیٹا یہ لوبان میں لوٹے میں گراتا جاؤں گا۔ پانی ایک بوتل میں لایا ہوں اگر وہ تمہاری ان زمینوں پر ہوا تو اس لوبان کا رنگ چونے جیسا سفید ہو کر پانی کو دودھیا کر دے گا تم دیکھتے رہنا۔

اس نے لوبان کی کنکریاں لوٹے میں گرانا شروع کر دیں۔ اور آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

کاش تم ان زمینوں کو ہی کام میں لانے کا سوچتے جو تمہارا باپ چھوڑ کر مرا ہے۔

بس چاچا اب کیا فکر ہو گی۔

ہاں ہاں۔ یکلخت لوٹے میں ابال سا شروع ہو گیا۔ یہ لوبان کا ایک موٹا سا ٹکڑا ڈالنے پر ہوا تھا۔

وہ مارا چاچا وہ یہیں پر ہے۔ ہم کامیاب ہو گئے۔ سوتے خان خوشی سے چیخ اٹھا۔

نہیں صاحبزادے اس پانی کو دور دور تک لائن سی بنا کر چھڑک دو۔ ایک طرف میں ڈالتا ہوں

تم دوسری جانب سے آؤ تاکہ وہ فرار نہ ہو سکے۔ چاچا نے کہا۔

مگر چاچا وہ تو بوتل میں بند ہے۔ سوتے نے جواب دیا۔

ہاں مگر وہ بوتل کو اپنی جگہ سے کھسکا بھی تو سکتا ہے۔ چاچا نے جواب دیا۔

ہاں یہ ٹھیک ہے اور اس رات تقریباً آدھی رات تک انہوں نے کافی دور تک نشان لگائے۔ چاند کی روشنی تھی اس لئے سوتے خان کو ڈر محسوس نہیں ہوا۔

بس چاچا اب تو بہت تھک گیا ہوں۔

ارے واہ بس اتنی سی محنت میں تھک گئے۔ نہ جانے ابھی تو کیا کیا کرنا پڑے گا۔ چاچا نے جواب دیا۔

ہاں چاچا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اسفل میرے قابو میں آجائے تو سب تھکن اتر جائے گی اب کیا کرنا ہوگا چاچا مجھے۔

اب سب سے پہلے تو جہاں تک نشان لگائے ہیں وہاں کی کھدائی کرنا ہوگی پھر اگلا عمل بتاؤں گا کیونکہ اس کی شرط یہ ہی ہے کہ ایک ہی بار پورا عمل نہیں بتا سکتا۔

سوتے خان کے دل میں آیا چولہے میں جائے یہ کام کون کرے گا اتنی کھدائی، مگر پھر دل نے کہا اسفل ہاتھ لگ گیا تو سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ ساری زندگی عیش ہوں گے۔ اس رات وہ جاتے ہی سو گیا۔ مگر جن پر قابو پانے کی ایسی دھن سوار تھی کہ صبح ہی سے کھدائی شروع کر دی۔ دس دن تک وہ ان حدود میں زمین کھودتا رہا مگر اسفل والی بوتل نہ ملی۔ وہ بڑی دیوانگی سے محنت کر رہا تھا۔

اس کے بازو تھکن سے شل ہونے لگتے مگر ایک جذبہ اسے کام کرنے پر اکساتا رہتا۔

چاچا کتنا عرصہ اور۔ اسفل تو نہیں ملا۔

ارے پاگل اس طرح کیسے ملے گی۔ جن کو اطمینان تو دلاؤ کہ اس کا آقا خالی ہاتھ نہیں ہے۔ تو نے دیکھا نہیں تھا اس دن لوبان کیسا پک رہا تھا اس کا مطلب ہے۔ جن کو کوئی کھانے کی چیز چاہیئے۔

مگر چاچا کس چیز کو دوں اسے۔

دیکھ بیٹا تو نے کسی کو بتایا تو نہیں تھا کہ تو نے زمین کیوں کھودی ہے۔

اتنا پاگل بھی نہیں ہوں چاچا۔ جس نے پوچھا میں نے کہہ دیا۔ فصل بوؤں گا۔ بیل خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہیں ہاتھوں سے ہی زمین کھود رہا ہوں۔

یہ بڑا اچھا جواب دیا تو نے۔ دیکھ ایسا کرتے ہیں تو اس میں پانی وغیرہ دے اور گیہوں بو دیتے ہیں اس

میں۔ لوگ بھی سمجھیں گے کہ تو واقعی گندم کی فصل بو رہا ہے۔ اس طرح جن کو کھانے کی چیز کا اطمینان بھی ہو جائے گا اور لوگ بھی مطمئن رہیں گے کہ واقعی گندم کی فصل بو رہا ہے۔ یاد رکھ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو ہو سکتا ہے کہ کوئی اور بات کو سمجھ جائے اب میری طرح اور کوئی بھی ہو سکتا ہے جسے یہ عمل معلوم ہو۔ وہ تو جان جائے گا۔ ساری بات اور وہ اس پر قبضہ کر لے گا اور ہماری محنت یونہی ضائع ہو جائے گی۔ اور یہ بات سوتے کی سمجھ میں آگئی اگلے دن اس نے گیہوں کے بیج تمام زمین میں ڈال دیئے۔

اب کیا کروں چاچا۔ بڑی محنت ہو رہی ہے۔ اس نے پڑوسی گے گھر آکر پوچھا۔

آہستہ میاں۔ دوسرے کمرے میں تیری چاچی سن لے گی۔ عورت ہے کسی سے بھی کہہ سکتی ہے۔ ابھی ایک عمل باقی ہے۔ تو ایسا کر باہر سے میرے کمرے کی کنڈی چڑھا جا۔ تیری چاچی سمجھے گی میں باہر ہوں۔ اس لئے وہ تنگ نہیں کرے گی۔ اور میں عمل آرام سے کر سکوں گا۔

ایک بات ہے چاچا۔ عمل تو کر رہا ہے مگر اسفل میرا غلام کیوں ہو گا؟۔

ارے بیٹا میں تو تیرے لئے کر رہا ہوں اپنے لئے کرتا تو کب کا کر چکا ہوتا۔ بوتل تیرے ہاتھ آئے گی۔ تو ہی کھولے گا تو وہ تیرا ہی غلام ہو گا اب تو جا اور دیکھ دروازے کی کنڈی آہستہ چڑھائیو۔

اچھا چاچا خدا حافظ

دوسری صبح سوتے خان سویرے اٹھ کر اس کی طرف آگیا۔

کیا ہوا چاچا۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

چاچا جو ابھی مسجد سے آکر بیٹھا ہی تھا۔ انگلیوں پر حساب لگاتا رہا۔

چار پانچ مہینے اور صبر کے ہیں۔ لوگ تو سالوں محنت کرتے ہیں۔ تجھے تو صرف اتنے دن کا عرصہ چاہیئے۔ ویسے تو یہاں بھی خوش قسمت نکلا۔ مجھے یقین ہے اسفل جلد ہی تیرے قابو میں ہو گا۔ دراصل مجھے معلوم ہوا ہے کہ اسفل بہت گہرائی میں چلا گیا ہے۔ وہاں سے اس کی بوتل گیہوں کے پودوں کی خوشبو اور پانی کی نمی سے اوپر آسکتی ہے ورنہ جتنا کھودو گے اتنا وہ نیچے جائے گی اور جیسے جیسے پودے بڑھیں گے وہ اوپر آتی جائے گی۔

اچھا چاچا یہ بھی کریں گے۔ وہ جوش سے بولا۔

اس دوران وہ زمین کو پانی بھی دیتا رہا۔ پھر اس نے کھاد بھی ڈالی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ بوتل جلد از جلد اوپر آئے اور اسفل اس کا ہو جائے۔

فصل تیزی سے بڑھی۔ فصل کے اخراجات چاچا برداشت کر رہا تھا۔ ماں اس کی تبدیلی پر خوش نظر آتی

تھی۔ جب فصل کٹی تو اس کی بے تابی کا عجیب عالم تھا اس نے دیوانگی کی حد تک محنت کی تھی۔ اور فصل کو تیار کیا ویسے سب کو حیرت تھی کہ سوتے خان اتنا محنتی کب سے ہو گیا۔ اس کی فصل سب سے اچھی رہی تھی۔ سب ہی اسے مبارکبادیں دے رہے تھے۔ اور وہ مبارکبادیں وصول کر کے خود کو حقیقتاً بڑا آدمی محسوس کر رہا تھا۔

جب فصل بکی اور چاچا نے اس کی آمدنی اس کے ہاتھ پر رکھی تو وہ حیران رہ گیا۔ اتنے پیسے ہاں بیٹا۔ اصل منصوبہ یہی تھا میرا۔ میں نے تمہاری کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور تم سے محنت کرائی۔ تم اب ایک محنتی نوجوان ہو۔ اس رات میں نے لوبان کی ڈلی کی بجائے بعد میں اس میں چونا ڈال دیا جو بظاہر پکتا ہی ہے۔ تم چونکہ کمزور عقیدہ بچے تھے میرے شعبدے میں آگئے۔

اب تم محسوس کر رہے ہو گے کہ آج اسفل تمہاری جیب میں ہے۔ تم اس محنت کے پیسے سے اپنی خواہشات پوری کر سکتے ہو۔ اس سلسلے کے اخراجات تمہاری ماں کے زیور فروخت کر کے پورے ہوئے ہیں۔ امید ہے اب تم بیل وغیرہ خرید کر محنت کرتے رہو گے۔

ہاں چاچا میں گمراہ تھا۔ خوابوں کی دنیا میں رہتا تھا اب محنت کرتا رہوں گا۔ کیونکہ میں حقیقت کی دنیا میں آگیا ہوں۔ واقعی حالت بدل دینے والا جن محنت ہے۔ جو ہمارے ہاتھوں میں ہمارے قابو میں ہے۔ میں اب بہت سے زرعی آلات لاؤں گا تاکہ کام جلدی ہو سکے۔

ہمارے نبیؐ نے ٹھیک فرمایا تھا محنت میں عظمت ہے۔ اس نے کہا اور ماں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

اور ٹھیک دس سال کے مختصر عرصے میں وہ گاؤں کا معزز چودھری بن گیا تھا اس نے آس پاس کی زمینیں خرید لی تھیں۔ اور آج اپنے دو بچوں کے ساتھ اپنی زمین پر ٹریکٹر چلتے دیکھ رہا تھا۔ محنت نے اسے عظمت دی تھی۔ کاہلی اور سستی کا اسفل جن آج صحیح معنوں میں اس کی قید میں تھا اور ہر طرف محنت کی عظمت کی دھوم رہی تھی۔ اور اب وہ سوتے خان کی بجائے چودھری صاحب کے نام سے مشہور تھا۔ یہ عزت اسے محنت نے بخشی تھی۔

سفر مبارک

معلومات بھی ــــ رہنمائی بھی

حجاج اور زائرین کے لیے نادر تحفہ!

۲۰۳ صفحات

یہ کتاب آپ صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے حاصل کر سکتے ہیں

ماہانہ مقابلۂ معلومات

سوال در سوال

اسامہ بن سلیم

"سوال در سوال" مقابلہ نمبر ۵ اور ستمبر ۸۸ کے جوابات حاضر ہیں۔ اس بار نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ ساتھی اس مقابلے میں شریک ہوئے بلکہ اکثر ساتھیوں نے تمام جوابات بھی درست بھجوائے۔ یہ یقیناً خوش آئند بات ہے۔ کبھی کبھار سوالات کا معیار جان بُوجھ کر مشکل کر دیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہوتا کہ جواب تلاش کرنے کی جستجو میں آپ وہ بہت کچھ بھی جان لیں جو اس سے قبل آپ کے علم میں نہ تھا۔۔۔۔ چونکہ ہر ماہ نئے نئے ساتھی بھی اس مقابلے میں شامل ہوتے رہتے ہیں، اس لیے شرکت کا طریقہ ہم ایک بار پھر بتا رہے ہیں۔

○ تمام سوالات کو بغور پڑھیے اور ان کے جوابات کوپن نما صفحے پر دیے ہوئے چھوٹے خانوں میں لکھ دیجیے۔ ○ پہلے جواب کا دوسرے سے اور دوسرے کا تیسرے سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ آپ کے نزدیک جو بھی مضبوط اور قریب ترین تعلق ہے آپ اُسے کوپن نما صفحے پر دیے گئے مستطیل نما خانے میں لکھ دیجیے اور یہ کوپن ہمیں بھجوا دیجیے۔ مقابلے میں شرکت کی آخری تاریخ ۲۵ نومبر ہے۔ ○ قرعہ اندازی کے ذریعے تین انعامات بھی دیے جائیں گے۔ جس میں پہلا انعام ۱۰۰ روپے اور بقیہ دو انعامات کُتب کی صورت میں ہوں گے۔ ○ اپنے جوابات صاف اور خوش خط لکھیں۔ کوپن احتیاط سے کاٹیں۔ بغیر کوپن کے مقابلے میں شرکت ممکن نہیں۔

سوالات

۱ تحریکِ آزادی کے نامور رہنما اور عالم دین جو "شیخ الہند" اور "اسیرِ مالٹا" کے خطاب سے مشہور ہوئے؟

۲ ۱۹۸۱ء میں جہانگیر خان نے ۱۸ سال سے کم عمر میں کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں اسکواش کے مشہور کھلاڑی جیف ہینڈ کو شکست دے کر پہلی بار عالمی چیمپئن شپ حاصل کی۔ یہ تاریخی کامیابی جہانگیر خان نے کس مہینے میں حاصل کی۔؟

۳ واحد ایشیائی جنہیں اقوامِ متحدہ کا سیکریٹری جنرل منتخب کیا گیا۔۔۔؟

۴ ساکیا قبیلے کے کھتری راجا شدھودن (سدھودانا) کا بیٹا جسے طویل ریاضت کے بعد نروان (عرفان) حاصل ہوا؟

۵ دنیا کی واحد ہندو سلطنت جس کا شمار دنیا کے غریب ملکوں میں ہوتا ہے؟

۶ علامہ اقبالؒ نے اپنی ایک مشہور نظم میں "فیصلِ کشورِ ہندوستان" کسے کہا ہے؟

۷ ایک دریا جس کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اس میں نہانے سے سارے گناہ دُھل جاتے ہیں؟

۸ بحرِ بند کی ایک خلیج جو تیرہ سو میل لمبی اور ایک ہزار میل چوڑی ہے ؟
۹ گھنے درختوں اور خطرناک جانوروں کے حوالے سے شہرت پانے والا ایک جنگل جس کا بیشتر حصہ بنگلہ دیش میں ہے؟
۱۰ بلّی کے خاندان کا ایک گوشت خور پستانیہ جسے شجاعت اور بہادری کی علامت سمجھا جاتا ہے ؟

جوابات "سوال در سوال نمبر۳

ماہ ستمبر ۱۹۸۸ء

۱ دنیا کا پہلا اولمپک "یونان" میں کھیلا گیا۔
۲ وہ مشہور فلسفی "ارسطو" ہے جسے فیلسوف اوّل بھی کہا جاتا ہے۔
۳ عظیم فاتح اور مقدونیہ کے بادشاہ فلپ کے بیٹے کا نام "سکندرِ اعظم" ہے۔
۴ مشہور باغات دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک "بابل کے معلق باغات" ہیں۔
۵ وہ ملک جو کبھی میسوپوٹیمیا کہلاتا تھا اب "عراق" کہلاتا ہے۔ عراق دریائے دجلہ و فرات کے درمیان واقع ہے۔
۶ برِّ اعظم ایشیا کا وہ ملک جس پر ۱۹۲۱ء میں۔۔۔ رضا علی خان نے قبضہ کیا "ایران" ہے۔
۷ بین الاقوامی شہرت کے حامل کھلاڑی نصیر بندا کا تعلق "ہاکی" سے تھا۔
۸ وہ ملک جو دو بار کی کوشش کے باوجود خلا میں راکٹ نہ بھجوا سکا "بھارت" ہے۔
۹ سترہ روز تک لڑی جانے والی پاک بھارت جنگ "جنگِ ستمبر" کے نام سے مشہور ہے۔
۱۰ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں سب سے زیادہ طیارے گرانے کا ریکارڈ اس وقت کے اسکواڈرن لیڈر "ایم ایم عالم" نے قائم کیا۔

جوابات کا باھمی تعلق

½ ارسطو کا تعلق یونان سے تھا۔
⅔ ارسطو سکندرِ اعظم کا استاد تھا۔
¾ سکندرِ اعظم نے بابل میں وفات پائی۔
⅘ بابل عراق میں واقع ہے۔
⅚ عراق اور ایران ہمسایہ ملک ہیں، طویل عرصے تک ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہنے کے بعد حال ہی میں دونوں ممالک کے مابین جنگ بندی کا معاہدہ ہوا ہے۔
⅙ ہاکی کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کا آغاز ایران سے ہوا۔
⅞ بھارت ہاکی کھیلنے والے ملکوں میں سے ایک ہے۔
⅑ بھارت اور پاکستان کے مابین ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ایک جنگ ہوئی جو سترہ روز تک جاری رہی۔
½ جنگ ستمبر میں اسکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم نے سب سے زیادہ جہاز گرانے کا ریکارڈ قائم کیا۔

انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب

- اے۔ رفعت احمد۔ ٹاؤن شپ، لاہور
- سعدیہ خورشید نشتر روڈ، کراچی
- شیراز بشیر افشاں کالونی۔ راولپنڈی۔

نومبر ۱۹۸۸ء

کوپن ماہانہ مقابلۂ معلوماتِ عامہ

۲	۱	جواب نمبر ۱ اور ۲ کا تعلق
۳		جواب نمبر ۲ اور ۳ کا تعلق
۴		جواب نمبر ۳ اور ۴ کا تعلق
۵		جواب نمبر ۴ اور ۵ کا تعلق
۶		جواب نمبر ۵ اور ۶ کا تعلق
۷		جواب نمبر ۶ اور ۷ کا تعلق
۸		جواب نمبر ۷ اور ۸ کا تعلق
۹		جواب نمبر ۸ اور ۹ کا تعلق
۱۰		جواب نمبر ۹ اور ۱۰ کا تعلق

مقابلے میں شرکت کے لیے کوپن کا آنا ضروری ہے۔

نام ________ مکمل پتہ ________

حاصل کردہ نمبر

دُودھ کی بدولت

ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال

روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت

کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"

ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔

اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔

اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔

دانائی کی بات سنو

دُودھ پیو — مضبوط بنو

اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

MASS

درست جواب ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام

طارق علی۔ لطیف آباد۔ حیدرآباد ● محمد عمران قادر، ٹنڈوآدم ● محمد احسن، چوک بازار، ملتان ● نجم خان، پکا قلعہ، حیدرآباد ● محمد مرتضےٰ خان، نشتر روڈ، ملتان ● محمد رفیق، گرومندر، کراچی ● محمد شاہد رسول، لطیف آباد، حیدرآباد ● محمد راشد بھٹائی نگر، حیدرآباد ● ساجد جمیل، لانڈھی کراچی ● کاشف عزیز جوئیہ، عارف والا۔ ● حامد الیاس، جہانگیر پورہ، پشاور ● سعدیہ نورین رحمانپورہ، لاہور ● تجمل الیاس، سمن آباد، لاہور ● شارق شمیم، آگرہ تاج کالونی، کراچی ● وسیم آزاد۔ نشاط آباد، فیصل آباد ● عاشق حسین نازش، سنجھورو، ضلع سانگھڑ ● اسماعیل عبدالرحمٰن میٹھادر، کراچی ● محمد یٰسین اندوری سائی پاڑہ، حیدرآباد ● صبیح الدین خاں، پھلیلی پار، حیدرآباد ● صدف سراج، پھلیلی پار، حیدرآباد ● شہنشاہ بابر خان، فاروق آباد، بہاولنگر ● محمد سہیل پاریکھ گذدرآباد، کراچی ● نوید علی ہاشمی، سنجھورو، ضلع سانگھڑ ● عبدالعلیم خان۔ شارع اقبال، کوئٹہ ● خرم عبدالحمید بٹ، گلشن اقبال، کراچی ● حسن مہدی خراسانی، انچولی، کراچی ● حارث وحید، رنگ محل، لاہور ● سید اعجاز احمد، اٹامک سینٹر، ٹنڈوجام ● ظہیرالٰہی بابر، ریلوے کالونی، حیدرآباد ● محمد امین سیف الملوک سانگھڑ ــــ

ایک غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام

حاجی ابراہیم۔ بغدادی، کراچی ● ہارون رشید ہیرا، رحیم یار خان ● معین الدین محمد، یونیورسٹی کیمپس پشاور ● حمیرا نعیم، لیاقت پور، رحیم یار خان ● عنبرین گلزار علی، گارڈن ویسٹ کراچی ● نازش گلزار علی گارڈن ویسٹ، کراچی ● حنا جعفری، قصبہ کالونی، کراچی ● صائمہ تبسم، مری روڈ، راولپنڈی ● غلام مرتضیٰ گاڑی کھاتہ، حیدرآباد ● شفیق الرحمٰن، حالی نگر، حیدرآباد ● احمد تنیشط چغتائی، ماڈل ٹاؤن ڈیرہ غازی خان ● ملک سرفراز احمد، گل گشت کالونی، ملتان ● تجمل حسین ماجد، بہاول نگر ● سید اطہر سعید کاظمی شاداب کالونی، ملتان ــــ

دو غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام

● غلام حسین میمن، کھائی روڈ، حیدرآباد ● وقار بشیر، طفیل روڈ، راولپنڈی ● محمد رفیق، گھاس منڈی کراچی ● شان الحق، ہیرآباد، حیدرآباد ● صائمہ مبین، گلبرگ، لاہور ● شیخ حبیب اللہ دین پوری، شاہی روڈ خانپور ● شکیل احمد طور، مردان ● عاصم رضا، سٹیلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی ● جمال عبدالناصر، پنڈ دادن خان جہلم ● محمد عامر فاروق، گوجرہ ● واسیہ مظہر، چوک ناخدا، لاہور ــــ

نقطے والے حصوں میں رنگ بھریے
پھر دیکھیے کیا بنتا ہے .....

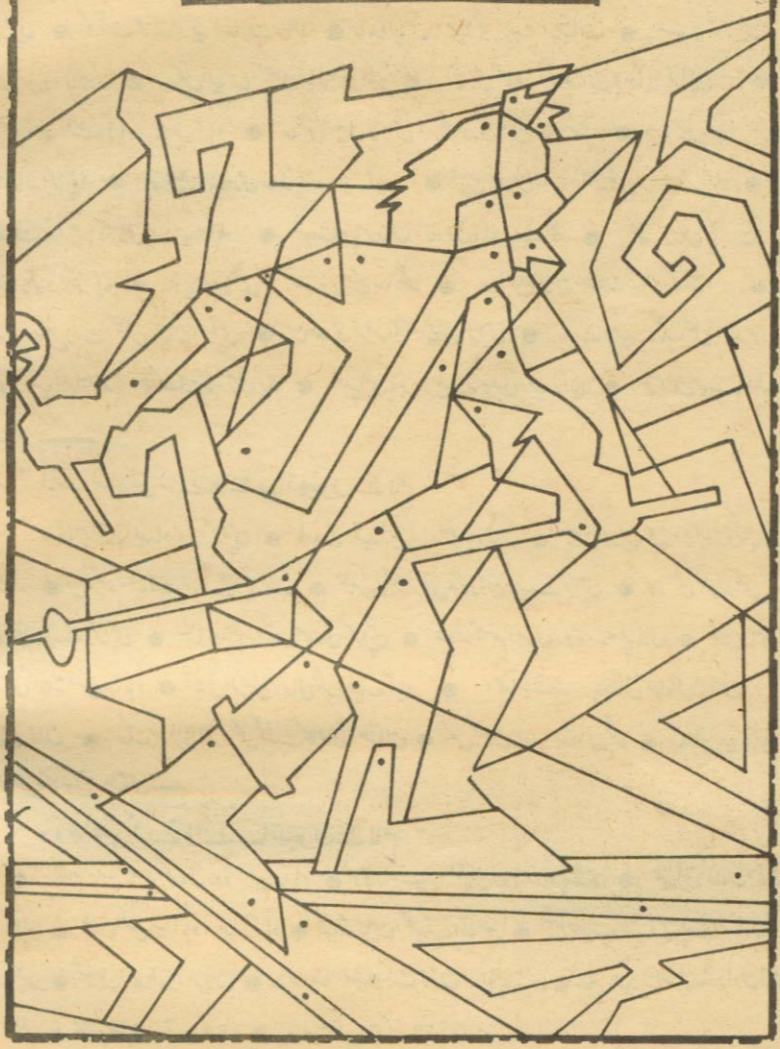

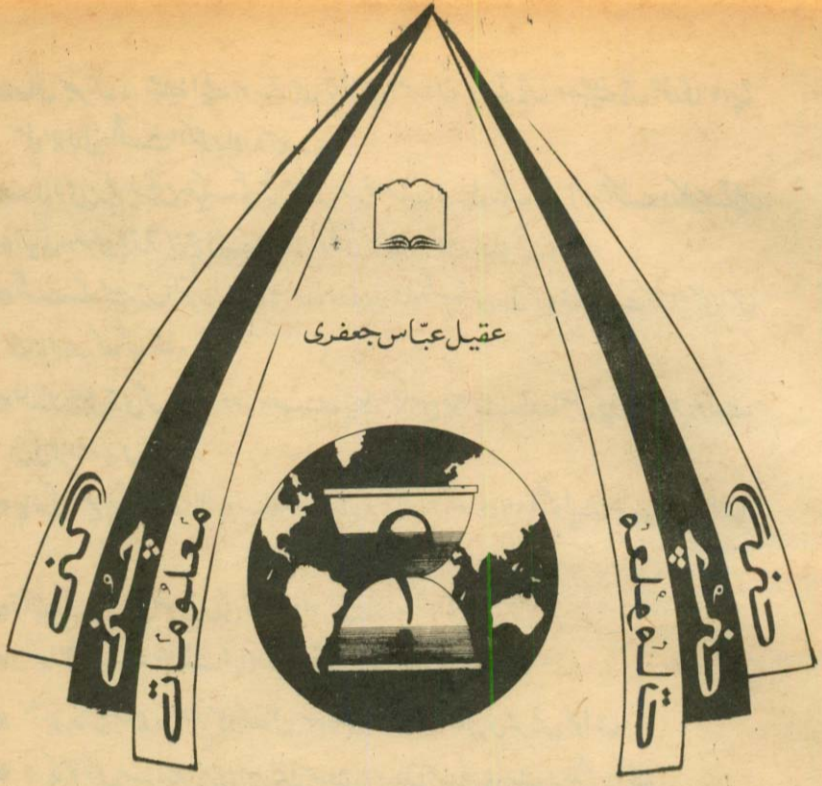

عقیل عباس جعفری

اعداد کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ دُنیا کی اہم شخصیات ہوں یا بڑے بڑے واقعات ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح اعداد سے ضرور بنتا ہے۔ اعداد کے حوالے سے دُنیا بھر کی اہم معلومات پر مبنی یہ سلسلہ ہم ہر ماہ آپ کی دلچسپی اور معلومات میں اضافے کے لیے پیش کرتے ہیں صفر سے شروع ہونے والا سلسلہ دیکھیے کہاں تک جاتا ہے۔

(۳۱)

- سورۂ رحمٰن میں آیت فبای الاء ربکما تکذبٰن ۳۱ مرتبہ استعمال ہوئی ہے۔
- جب ایڈیسن نے آواز ریکارڈ کرنے والا آلہ فونوگراف پیٹنٹ کروایا تو اس کی عمر صرف ۳۱ برس تھی۔
- ۳۱ اگست ۱۹۶۸ء کو سوبرز نے ایک اوور میں چھ چھکے مار کر عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔
- کوئٹہ میں قیامت خیز زلزلہ ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کو آیا تھا۔

● سال بھر میں ۷ مہینے ایسے ہوتے ہیں۔ جن میں ۳۱ دن ہوتے ہیں۔ وہ مہینے ہیں جنوری، مارچ مئی، جولائی، اگست، اکتوبر اور دسمبر۔

● برطانوی پرچم یونین جیک کی تیاری میں سرخ، سفید اور نیلے رنگ کے ۳۱ ٹکڑے درکار ہوتے ہیں۔

● دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو ۳۱ جولائی ۱۹۵۴ء کو سر ہوئی تھی۔

● اگست کے مہینے میں اکتیسویں دن کا اضافہ رومی بادشاہ اگسٹس نے کیا تھا۔ اگست کا نام بھی اسی کے نام پر رکھا گیا تھا۔

● خلا میں چہل قدمی کرنے کا اعزاز سب سے پہلے الیکسی لیونانف نے حاصل کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۱ برس تھی۔

● چاند کی سطح پر اُترنے والا پہلا خلائی جہاز لونا نہم ۳۱ جنوری ۱۹۶۶ کو اپنے سفر پر روانہ ہوا تھا۔

(۳۲)

● قرآن پاک میں مدنی سورتوں کی تعداد ۳۲ ہے۔

● اسکواش کورٹ ۳۲ فٹ لمبا اور ۲۱ فٹ چوڑا ہوتا ہے۔

● مشہور فاتح سکندر اعظم کا انتقال ۳۲۳ ق م میں ۳۲ سال کی عمر میں ہوا تھا

● امریکہ کا نواں صدر ولیم ہنری ہیریسن صرف ۳۲ دن عہدۂ صدارت پر فائز رہا تھا

● دنیا کا پہلا کراس ورڈ معمہ ۲۱ دسمبر ۱۹۱۳ء کو نیویارک ورلڈ میں شائع ہوا تھا۔ اس معمے میں ۳۲ اشارے تھے۔

● ٹیپو سلطان ۱۷۸۲ء میں میسور کے حکمران بنے۔ اس وقت اُن کی عمر ۳۲ برس تھی۔

● پہلی عالمی جنگ کا اختتام معاہدۂ ورسائلز سے ہوا۔ اس معاہدے پر ۳۲ اقوام نے دستخط کیے تھے۔

● دنیا کا پہلا ہوئی جہاز ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کو کٹی ہاک کے مقام پر اورول رائٹ نے اُڑایا۔ اس وقت اورول رائٹ کی عمر ۳۲ برس تھی۔

● انسان کے منہ میں ۳۲ دانت ہوتے ہیں۔

● اگر ہوا کی رفتار ۳۲ میل فی گھنٹہ یا اس سے زائد ہو تو اُسے سائنسی اصطلاح میں آندھی کہتے ہیں۔

- رقبے کے لحاظ سے پاکستان دنیا کا ۳۳ واں بڑا ملک ہے۔
- ہجری اور عیسوی کیلنڈروں میں ہر ۳۳ برس بعد ایک پورے سال کا فرق پڑ جاتا ہے۔
- پیرس کے مشہور دریا، دریائے سین پر کل ۳۳ پُل تعمیر کیے گئے ہیں۔
- ڈبل روٹی کے ایک سلائس میں ۳۳ فیصد پانی ہوتا ہے۔
- دنیا کی سب سے طویل سرنگ کا نام سیکن ہے جو جاپانی جزائر ہونشو اور ہوکیڈو کو آپس میں ملاتی ہے۔ یہ سرنگ ۳۳ میل لمبی ہے۔
- سر ایڈمنڈ ہیری ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والے پہلے شخص تھے۔ انھوں نے یہ کارنامہ ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء کو انجام دیا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۳ سال تھی۔
- امریکہ کے مشہور گلوکار ایلوس پریسلے نے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۷۷ء کے دوران ۳۳ میوزیکل فلموں میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔
- دریائے ٹیمز پر پتھر کا پہلا پُل ۱۱۷۶ء میں مکمل ہوا۔ یہ پل ۳۳ سال کے عرصے میں تعمیر ہوا تھا۔
- بحرِ اوقیانوس پر پہلی تنہا پرواز ۲۰-۲۱ مئی ۱۹۲۷ء کو چارلس لِنڈبرگ نے کی۔ انھوں نے ۳۶۱۰ میل کا یہ فاصلہ ۳۳ گھنٹے ۳۹ منٹ میں طے کیا تھا۔
- ۱۹۸۶ء میں ہیلی کا دُمدار ستارہ ۳۳ ویں مرتبہ نظر آیا تھا۔ ریکارڈ کے مطابق یہ ستارہ پہلی مرتبہ ۴۶۷ ق م میں دیکھا گیا تھا۔

راہنما

۱۰۴ صفحات پر مشتمل

سچی قرآنی کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ

قرآن کی یہ سچی کہانیاں بچوں کی تربیت میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں

اس کے حصول کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجیے

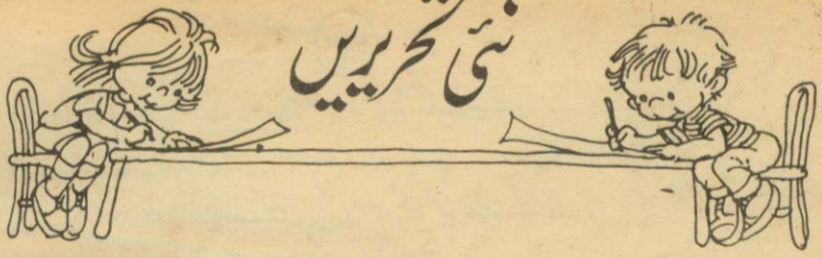

نئی تحریریں

"نئی تحریریں" نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے اندر کی چھپی ہوئی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں۔ اس لیے تحریر روانہ کرتے وقت ان باتوں کا خیال رکھیے۔

- تحریر کاغذ کے ایک جانب ایک سطر چھوڑ کر خوشخط لکھی گئی ہو۔
- تحریر نقل شدہ نہ ہو۔
- اپنا نام اور پتہ صاف صاف لکھیے۔

(ادارہ)

دُعا

مجھے دے الٰہی تُو وہ زندگی
کروں میں ہر اک پل تری بندگی

مجھے نیک اطوار و دانا بنا
مجھے نیک رستے پہ چلنا سکھا

مجھے علم و حکمت کی دولت ملے
سخاوت ملے اور شجاعت ملے

غریبوں کا خادم بنا دے مجھے
خطاؤں پہ نادم بنا دے مجھے

الٰہی! وطن میرا آباد رکھ!
وطن کے مکینوں کو دل شاد رکھ

مجھے دینِ حق کا سپاہی بنا
مجھے نیک راہوں کا راہی بنا

مرسلہ:۔ فضلِ ربی راہی، منگورہ۔ سوات

درخواست (نظم)

گزارش ہے فدوی کی سرکار میں
کہ عرضی ہو منظور دربار میں

میں کل سے بہت سخت بیمار ہوں
میں اسکول آنے سے لاچار ہوں

مجھے آج رُخصت عطا کیجیے
رجسٹر میں آمد لگا دیجیے

مرض سے شفا جب بھی پاؤں گا میں
تو اسکول فوراً ہی آؤں گا میں

نوازش بہت ہوگی سرکار کی!
کہ عرضی ہو منظور بیمار کی

مرسلہ۔ انیس الرحمٰن۔ کراچی

حج اکبر

رسول بخش سٹھیو
ٹنڈو محمد خان

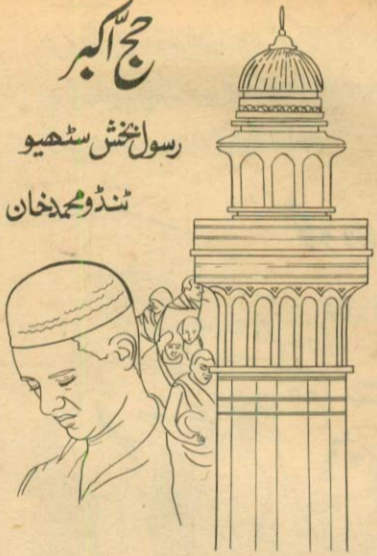

یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب بسیں، گاڑیاں، موٹریں اور جہاز وغیرہ نہیں تھے۔ لوگ کبھی سفر کرتے تو پیدل یا کسی جانور پہ سوار ہو کر کرتے۔ ان مشکل دنوں میں بھی وادیٔ سندھ (باب الاسلام) کے لوگ حج کرنے جایا کرتے تھے اور چار پانچ برسوں بعد وطن لوٹتے تھے۔ کچھ تو راستے میں ہی مر کھپ جاتے۔ حج پر جانے کے لیے کوئی خاص تیاری نہیں ہوتی تھی۔ بس ایک جوڑا کپڑوں کا ساتھ لیا کچھ پیسے لیے اور سرزمینِ حجاز کی طرف چل دیے۔ وہ بڑے متوکل تھے۔ ان کے توکل کا عالم یہ تھا کہ ایک وقت کا کھانا بھی نہ اُٹھاتے تھے بس راستے میں کوئی اللہ کا بندہ مل جاتا تو کھانا بھی مل جاتا۔

انہی دنوں علّن کو بھی حج کرنے کا شوق ہوا۔ لہٰذا والدین سے اجازت لے کر کپڑے اور کچھ پیسے ساتھ لیے اور خدا کا نام لے کر چل پڑا۔ وہ دن رات چلتا رہا۔ کبھی راستے میں کوئی گاؤں مل جاتا تو وہاں سے کھانا کھاتا اور پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑتا۔ جب وہ بہت دُور نکل گیا، تب اُسے پتا چلا کہ وہ راستہ بھول گیا ہے۔ اس وقت وہ ایک بیابان میں تھا۔ وہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ اُسے پیاس بھی بہت لگی تھی۔ وہ چلتا رہا، چلتا رہا۔ یہاں تک کہ دُور ایک کنواں نظر آیا۔ کنویں کے نزدیک ہی ایک حوض تھا۔ جس سے وہ سمجھا کہ شاید یہاں کوئی آدمی رہتا ہے۔ قریب ہی ڈول بھی پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے ڈول کنویں میں ڈالا اور پانی نکال کر پینے لگا۔ جب بہت سا پانی پی کر اُس نے اپنی پیاس بجھائی تو اُٹھا اور چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے اپنے عقب میں دیکھا تو اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ ایک بہت بڑا شیر اس سے قریباً سات آٹھ گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ علّن کے جسم پر خوف سے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

شیر کے ہونٹ خشک تھے۔ اس نے سوچا کہ شاید شیر بھی پیاسا ہو، اُسے معلوم تھا کہ شیر اب اُسے زندہ نہیں چھوڑے گا، لیکن پھر بھی ایک اُمید اس کے دِل میں جاگ اُٹھی۔ وہ تیزی سے حوض کو بھرنے لگا۔ کچھ دیر میں حوض پانی سے بھر گیا تو اُس نے آہستہ آہستہ کھسکنا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ حوض سے دُور ہوتا گیا، ویسے ہی شیر حوض کے قریب آگیا اور پانی پر جھپٹ پڑا، شاید بہت دنوں کا پیاسا تھا۔ اس اثنا میں علّن بہت دُور جا چکا تھا اور خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ شیر سے نجات ملی۔

وہ چلتا رہا اور چلتے چلتے ایک سڑک پر آگیا۔ اس وقت سورج غروب ہونے والا تھا۔ اچانک سامنے سے ایک ٹرک آتا دکھائی دیا۔ ٹرک قریب آکر اُس کے اشارے

پر رُک گیا۔ ٹرک بوریوں سے بھرا ہوا تھا۔ ٹرک ڈرائیور سندھی زبان نہیں بول سکتا تھا اس لیے دونوں نے اشاروں میں باتیں کیں۔ پھر ٹرک ڈرائیور نے اُسے بوریوں میں چھپا لیا، کیونکہ آگے چیکنگ ہو رہی تھی ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد وہ ایک شہر میں پہنچے۔ وہاں بھی ٹرک کی چیکنگ کی گئی، لیکن ان کی خوش قسمتی تھی کہ بچ نکلے وہ پھر چلنے لگے اور شہر سے کچھ دور ٹرک رُک گیا۔ ٹرک ڈرائیور نے علن کو بوریوں سے نکالا اور دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے ڈرائیور نے علن کو بتایا کہ اب صرف تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا ہے۔ آگے بھی ایک شہر آئے گا اور وہاں بھی چیکنگ ہوگی، لیکن یہ آخری چیکنگ ہوگی۔ کھانا کھا کر ڈرائیور نے علن کو پھر بوریوں کے نیچے چھپا دیا۔ ٹرک سارا دن چلتا رہا اور رات کو شہر جا پہنچا، وہاں بھی چیکنگ کی گئی۔ علن نے دیکھا کہ چیکنگ کرنے والے بوریوں کو اِدھر اُدھر ہلا ہلا کر دیکھ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ ڈر گیا آخر خُدا خُدا کر کے چیکنگ ختم ہوئی اور ٹرک پھر چلنے لگا۔

ساری رات ٹرک چلتا رہا اور صبح جا کر ایک سرحدی راستے پر رُکا۔ ڈرائیور نے آکر اُسے بوریوں میں سے نکالا اور کہا "یہ پاک سرزمینِ عرب ہے اب تم جاؤ" جواب میں علن اُسے صرف گھورتا ہی رہا۔ تو ڈرائیور کو یاد آیا کہ ہم تو صرف اشاروں سے ہی باتیں کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ڈرائیور نے اشاروں سے علن کو بتایا کہ اُسے اب جانا چاہیے کیونکہ یہ دوسرے مُلک کی سرحد ہے اور وہ اس کے ساتھ اب نہیں جا سکتا۔ علن سمجھ گیا اور چلنے لگا۔ یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ وہ اب سرزمینِ حجاز میں تھا۔

اُدھر بہت سے سال گزر جانے کے باعث علن کے عزیز سمجھے کہ شاید وہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے، لہٰذا انھوں نے اس کا سوگ منایا۔ ختم القرآن کیا۔ یہاں تک کہ چہلم بھی کر دیا لیکن پھر ایک دن یہ دیکھ کر سب حیرت اور خوشی سے جھومنے لگے کہ علن زندہ سلامت اور حاجی بن کر آ رہا ہے

خود دار

فضلِ ربی راہی

مینگورہ

"مونگ پھلی... مونگ پھلی... بڑھیا مونگ پھلی ہے"

مین روڈ سے گزرتے ہوئے میرے کانوں میں آج بھی وہی آواز آئی۔ ایک چھوٹا سا معصوم لڑکا سر پر مونگ پھلی کی ٹوکری اُٹھائے آوازیں لگا رہا تھا "مونگ پھلی لے لو... مونگ پھلی" اس کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ پہلی بار یہ کام کر رہا ہے۔

لڑکے کے حلیے اور شکل و شباہت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا تعلق افغان پناہ گزینوں سے ہے۔ مجھے اس کی بھولی بھالی صورت پر بڑا ترس آیا۔ اور دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات گردش کرنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ناز و نعم میں پلے ہوئے کیسے کیسے لوگ دَر دَر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ مجھے وہ لڑکا امداد کا مستحق دکھائی

دیا۔ میں نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اس کو دیا اُس نے نوٹ لے کر ٹوکری سر سے نیچے رکھ دی، لیکن میں آگے بڑھ گیا تھا۔ اُس نے آواز دے کر کہا "بابو جی مونگ پھلی تو لے لیجئے" اس کا لہجہ بہت شائستہ اور مہذب تھا۔ میں رُک گیا۔ "نہیں تم یہ پیسے ویسے ہی رکھ لو" میں نے پیار سے کہا۔ یہ سُن کر اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور کہنے لگا "میں مونگ پھلی بیچتا ہوں بھیک نہیں مانگتا" یہ مونگ پھلی لے لیں یا اپنے روپے" اس نے نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں ایک عجیب درد تھا جس سے معلوم ہو رہا تھا کہ میری بات سے اُسے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ میں نے شرمندگی سے بچنے کے لیے کہا "اچھا اچھا یہ پیسے رکھ لو، میں ابھی آکر مونگ پھلی لے لوں گا" مجھے بہت ندامت محسوس ہوئی مگر یہ دیکھ کر کہ لڑکے نے نوٹ رکھ لیا ہے، خوشی بھی ہوئی کہ شرمندگی سے بچنے کی کوئی صورت تو نکل آئی۔ میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔۔۔ میں سوچ رہا تھا" یہ لڑکا کس قدر غیرت مند ہے۔ بارہ سال کا بھی تو نہیں لگ رہا ہے مگر بھیک مانگنے سے کس قدر نفرت کرتا ہے۔ غربت و افلاس نے بھی اس کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ واپسی پر میں نے جان بوجھ کر راستہ بدل لیا تاکہ اُس لڑکے سے سامنا نہ ہو۔

چند روز بعد پھر اتفاقاً اسی سڑک سے گزر رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں سے ایک مانوس سی آواز ٹکرائی۔ میں چونک کر مُڑا۔ "بابو جی! او بابو جی۔۔۔" میں نے آواز کی سمت دیکھا۔۔۔ وہی لڑکا مجھے پکار رہا تھا" آپ مونگ پھلی لینے کیوں نہیں آئے؟ میں روزانہ یہیں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔ میرا کس قدر نقصان کیا ہے آپ نے، جھوٹا وعدہ کیا تھا، مسلمان جھوٹا وعدہ تو نہیں کرتا" اس نے اتنی ڈھیر ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں۔

"میں بھول گیا تھا" میں نے پھر جھوٹ بولا" لیجئے اپنی مونگ پھلی" اس نے کہا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا جھٹ بولا "خیر اب چھوڑ دو اب مونگ پھلی لے کر کیا کروں گا" اُس نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیا میں دنگ رہ گیا۔ لڑکا کہہ رہا تھا:۔

"میں بھیک نہیں لیتا بابو جی" میں بولا" یہ تم اپنی اس تکلیف کے عوض رکھ لو، جو تم نے انتظار کر کے اُٹھائی ہے"

"معلوم نہیں آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ جن روپوں کے بدلے میں نے آپ کو کچھ نہیں دیا اور نہ ہی میں نے آپ کا کوئی کام کیا ان کو آخر میں کس طرح لے لوں۔ کیا یہ رقم مجھ پر حرام نہ ہو گی؟"

یہ سُن کر میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ میرا سر خود بخود جھک گیا۔ اُس کی باتوں نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ میں خود کو اس سے کمتر سمجھنے لگا۔ وہ واقعی غیور لڑکا تھا۔

"لیجئے صاحب! اپنی مونگ پھلی لے لیں۔ مجھے کچھ کمانا بھی ہے" یہ سُن کر میں خیالات کی دُنیا سے باہر نکل آیا اور اس سے مونگ پھلی لے لی

"بڑے مزے کی مونگ پھلی۔۔۔ لے لو مونگ پھلی۔۔۔ اچھی مونگ پھلی۔۔۔ بڑھیا مونگ پھلی۔۔۔" وہ لڑکا آوازیں لگاتا ہوا سڑک پر آگے بڑھ گیا اور میں شرمندگی اور ندامت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔

انوکھا گدھا

مسلمی رحمٰن ——— بورے والا

گرمیوں کے دن تھے، دوچور دوپہر کے وقت ایک دیوار کے سائے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور کچھ چرانے کی فکر میں تھے۔ ایک کا نام راجو تھا اور دوسرے کا اجّو۔

"آہ، عید بالکل قریب آگئی ہے اور میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں، اگر دوست یار ملنے کو آگئے تو چائے کہاں سے پلاؤں گا۔ اُن کے سامنے مجھے کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔"

"اور اپنا بھی یہی حال ہے۔" اجّو نے کہا۔ "ہمیں جلد کوئی تدبیر کرنی چاہیئے۔"

اچانک راجّو کی نظر سامنے آتے ہوئے ایک بوڑھے آدمی پر پڑی۔ جو ابھی کافی دُور تھا، لیکن اُسی طرف آرہا تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے اُس کا گدھا تھا، جس پر بوڑھے آدمی نے سامان لادا ہوا تھا۔ آدمی اور گدھے کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔

"دیکھو اجّو۔۔۔" راجو نے کہا "وہ ایک شخص آرہا ہے۔ شکل وصورت سے شریف، لیکن بیوقوف نظر آتا ہے۔ ہمیں اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ ہم اُس کا گدھا چُرالیں گے۔ اور اُسے بازار میں بیچ دیں گے۔ اس طرح ہم عید بڑے ٹھاٹ سے منا سکیں گے۔"

"تم بالکل گدھے ہو، ہم اُسے کیسے چُرا سکتے ہیں۔ وہ شخص ہمیں دیکھ لے گا۔" اجّو بولا۔

"تم تو بدھو ہو۔ بس جو میں کہتا ہوں، ویسا کرتے جاؤ۔ وہ سر جھکائے ہوئے آرہا ہے۔ اس لیے ہمیں نہیں دیکھ سکے گا۔ جب وہ ہمارے پاس سے گزرے، تم فوراً گدھے کی طرف بھاگنا اور اس کا سامان اُٹھا کر مجھ پر لاد دینا۔ ہم یہ ترکیب اس وقت استعمال کریں گے، جب وہ گلی کا موڑ مڑے گا۔ پھر تم گدھے کو گھر لے جانا۔ میں اُس کے ساتھ ساتھ اُس کے گھر چلا جاؤں گا۔" راجو نے ترکیب بتائی۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور اس شخص کو پتا بھی نہ چل سکا۔

جب وہ شخص گھر پہنچا اور اُس نے مُڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ بڑا حیران ہوا۔ کہ گدھے کے بجائے ایک آدمی نے اُس کا سامان اُٹھا رکھا ہے۔ اُس شخص نے پوچھا "تم کون ہو اور وہ گدھا کہاں ہے جس پر میرا سامان لدا ہُوا تھا؟"

اجّو جو گھٹنوں کے بل سر جھکائے کھڑا تھا، کہنے لگا "خدا آپ پر برکت نازل کرے، اے بزرگ آدمی...! اے میرے مالک! سُنیئے، میں آپ کو اپنی کہانی سُناتا ہوں میں وہی ہوں، جو ایک مدت سے گدھا بنا ہوا تھا۔"

آدمی نے کہا، "یہ کیا عجیب وغریب بات ہے۔ تم گدھے کیسے بن گئے؟"

راجو نے کہا: "بڑی مدت کی بات ہے، میں مالدار آدمی تھا اور جوان بھی، لیکن افسوس کہ میں بہت مغرور تھا۔ ایک دن میں نے غصے میں آکر اپنی بہن کو مارا، جس کی سزا میں، میں گدھا بن گیا۔ میں گھر سے بھاگ نکلا، لیکن راستے میں مجھے ایک آدمی نے پکڑ لیا اور بازار میں لے جا کر فروخت کر دیا۔" یہ ہے میرے گدھا بننے کی کہانی!"

"واقعی یہ کہانی بڑی انوکھی ہے، لیکن اب تم آدمی کیسے بن گئے۔ جبکہ مجھے تمہیں خریدے ہوئے بھی پانچ سال ہونے کو آئے؟" اس آدمی نے پوچھا۔

"اے میرے آقا! یہ آپ کی مہربانی ہے کہ میں ایسا بن گیا۔ آپ نے مجھے شرافت کا سبق سکھایا، وہ لاتیں جو آپ مجھے مارا کرتے تھے، میرے اس جرم کی سزا تھی۔ جو میں نے اپنی بہن کو دی تھی۔ آپ کے اخلاق نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ اور اللہ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے راجو نے آدمی کے ہاتھ چوم لیے۔۔۔

آدمی نے اُسے سہارا دے کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ اور بولا" تعریف ہے اُس خدا کی جس کے راز انسان نہیں سمجھ سکتا۔ آؤ میرے ساتھ، ہم اندر بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔" راجو نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اُس شخص نے راجو کو بہت سے تحفے دے کر رُخصت کیا۔

اگلے روز جب وہ شخص بازار دوسرا گدھا خریدنے گیا تو سب سے پہلے جو گدھا اُس نے دیکھا وہ اُس کا اپنا گدھا تھا۔ اجو اور راجو نے اُسے فروخت کر دیا تھا۔ جب گدھے نے اپنے پُرانے مالک کو دیکھا تو وہ ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگا۔ آدمی نے اُسے ایک لات رسید کی اور بولا۔

"جا دفعہ ہو جا بے شرم! تو اتنی جلدی سب کچھ بھول گیا؟ کیا تو نے پھر اپنی بہن کو مارا ہے؟ اب میں تجھے نہیں خریدوں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک دوسرا موٹا تازہ گدھا خرید لیا۔

عقلمند خلیفہ

مظفر احمد، طاہرہ غازی خان

خلیفہ ہارون الرشید رات کے وقت ایک عام آدمی کا لباس زیب تن کرتے اور بغداد کی گلیوں میں نکل جایا کرتے تھے۔ وہ عام لوگوں میں گھل مل جایا کرتے تھے۔ اور لوگوں کی مشکلات اور مسائل سے آگاہ ہوتے تھے۔

ایک دن جب انہوں نے دربار لگایا ہوا تھا، کہ قاضی نے دو آدمیوں کو ان کے سامنے پیش کیا۔ ان میں سے ایک خوش پوش اور فرض شناس شہری معلوم ہوتا تھا۔ جبکہ دوسرا فقیر معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اس نے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

ان دونوں آدمیوں کے درمیان ایک خوبصورت سفید گھوڑا کھڑا تھا۔ قاضی نے خلیفہ سے کہا۔ اے امیر المومنین! میں ایک جھگڑا لایا ہوں۔ جسے میں حل نہیں کر سکا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے علم اور عقل مندی کی وجہ سے اس مسئلے کا صحیح اعلان فرمائیں گے۔

خلیفہ نے پوچھا۔ "جھگڑا کیا ہے۔؟"

قاضی نے کہا یہ دونوں آدمی اس گھوڑے پر لڑ

رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دعویٰ کرتا ہے اور قسم کھاتا ہے کہ یہ گھوڑا اُس کا ہے۔

خلیفہ نے خوش پوش آدمی سے کہا آگے آؤ اور جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو۔

خوش پوش آدمی آگے بڑھا اور کہا اے امیر المومنین! میں جو کچھ کہوں گا اس پر آپ یقین کریں اور وہ سچ ہوگا۔

آج صبح جب میں گھوڑے پر سوار شہر کی طرف آ رہا تھا۔ کہ میں نے اس آدمی کو اپنے سامنے سڑک پر لنگڑاتے ہوئے دیکھا۔ یہ میرے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر مڑا اور مجھے روکنے کے لئے اشارہ کیا۔ اس نے شہر تک جانے کے لئے مجھ سے گھوڑا مانگا۔ میں نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور اسے اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ جب ہم شہر کے دروازے کے قریب پہنچے۔ میں رکا اور اسے نیچے اتارنے میں مدد دی۔ لیکن اس نے اترنے سے انکار کر دیا۔ میں پریشان ہو گیا۔ اور نرمی سے اترنے کو کہا کیونکہ ہم شہر کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ اس نے کہا میں گھوڑے سے نیچے کیوں اتروں۔ میں نے تمہیں گھوڑے پر سوار کیا اور اب تم مجھ سے میرا گھوڑا چھیننا چاہتے ہو؟

تب فقیر آہستہ سے آگے بڑھا اور کہا اے امیر المومنین آپ غریبوں کے مددگار اور محافظ ہیں۔ آپ عقلمند اور منصف مزاج خلیفہ ہیں۔ اس امیر آدمی کے ظلم اور ناانصافی سے مجھے بچایئے۔ میں قرآن کریم کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ "یہ گھوڑا میرا ہے"

آپ بھی دیگر درباریوں کی طرح سوچ رہے ہوں گے کہ کس طرح ایک غریب آدمی ایک خوبصورت گھوڑا خرید سکتا ہے اور رکھ سکتا ہے۔ جو کچھ میرے پاس تھا۔ میں نے اس گھوڑے پر خرچ کر دیا۔

آج صبح جب میں گھوڑے پر سوار شہر کی طرف آ رہا تھا۔ کہ میں نے اس آدمی کو سڑک پر پیدل چلتے دیکھا۔ جب میں اس کے نزدیک پہنچا۔ تو اس نے مجھے روک لیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اسے گھوڑا عاریتاً دے دوں۔

کیونکہ وہ بہت جلد شہر پہنچنا چاہتا تھا۔ میں ایک اجنبی شخص کو گھوڑا کیسے دے سکتا تھا۔ کیا میں ایسا کر سکتا تھا؟ اس کے بجائے میں نے اسے اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا اور خود پیچھے بیٹھ گیا اور گھوڑا اس کے حوالے کر دیا۔ جب ہم شہر کے قریب پہنچے۔ تو اس امیر آدمی نے کہا اتنا عمدہ گھوڑا فقیر کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ اب دفع ہو جاؤ اور اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ اور اگر تم نے ایسا کیا تو کوئی تمہارے پر یقین نہیں کرے گا۔ اب جناب مجھے اس بدمعاش سے بچایئے اور جو کچھ میرا ہے وہ مجھے دلوایئے

خلیفہ نے کہا میرا خیال ہے اس معاملے کا فیصلہ کرنا کوئی مشکل نہیں میں اسے ایک منٹ میں حل کر دوں گا۔ اس نے آدمیوں سے کہا باری باری اس گھوڑے کے ہاتھ لگائیں۔ اور فقیر کو پہلے ایسا کرنے دیں۔ جب فقیر نے گھوڑے کو چھوا تو اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ گویا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فقیر کا ہاتھ اسے لگے۔ لیکن جب امیر آدمی نے گھوڑے کے ہاتھ لگایا تو وہ بہت خوش ہوا اور خوشی سے ہنہنانے لگا۔

خلیفہ نے اعلان کیا کہ یہ گھوڑا اس امیر آدمی کا ہے۔

گھوڑا اس کے مالک کو دے دو۔ تب خلیفہ فقیر کی طرف مڑا اور کہا تم جھوٹے اور کمینے آدمی ہو۔ تم نے ایک ایماندار اور باعزت شہری کو لوٹنے کی کوشش کی ہے۔ تم سخت سزا کے مستحق ہو۔ لیکن اس بار میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ لیکن تمہیں اس امیر آدمی سے معافی مانگنی ہوگی۔ امیر آدمی نے فقیر کو معاف کردیا۔ اور اس پر افسوس کرتے ہوئے اپنا بٹوہ باہر نکالا۔ اور اس میں سے مٹھی بھر سونے کے سکّے فقیر کو دیئے۔ امیر آدمی کے اس نیک کام نے دربار میں موجود ہر شخص کو خوش کردیا۔

پیرس

مُرسلہ محمد عدیل ملک سٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی

شہر پیرس کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ کیونکہ شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جو اس شہر سے واقف نہ ہو اس کی سب سے بڑی وجہ وہ شہرت ہے۔ جو چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے اور اس شہرت کا انحصار کئی باتوں پر ہے مثلاً یہ کہ ایسے بہت کم شہر ہیں جہاں اتنی زیادہ تاریخی عمارات ہوں اور جو اتنی قدیم تہذیب کا حامل ہو۔

دنیا کے جتنے بھی خوبصورت شہر ہیں وہ کسی نہ کسی دریا یا سمندر کے کنارے آباد ہیں۔ لہٰذا اب ایک شہر کی خوبصورتی کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ اس شہر کے ساتھ کوئی سمندر یا دریا بہتا ہو۔

پیرس بھی دریائے سائن کے کنارے آباد ہے اور یہ فرانس کا دارالخلافہ ہے۔ روشنیوں کے شہر کا خطاب اِسے اس لیئے دیا گیا ہے کیوں کہ رات کے وقت ہر سُو روشنیاں اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتی ہیں۔

پیرس شہر درحقیقت جدید اور قدیم کا مرکب ہے یعنی اِسے ہم جدید اور قدیم دونوں کہہ سکتے ہیں۔ اس شہر کی تہذیب تقریباً دو ہزار سال پُرانی ہے۔ قدیم ہونے کی بناء پر یہ شہر بہت سے قدیم مقامات کا حامل ہے جن سے پیرس کی گذشتہ تاریخ وابستہ ہے۔ پیرس کے دلچسپ مقامات مندرجہ ذیل ہیں۔

نوٹرڈیم۔ یہ پیرس کا ایک خوبصورت گرجا گھر ہے اس کی تعمیر میں سو سے زائد سال صرف ہوئے۔ اس کے بالکل پیچھے سینٹ چیپل ہے جو کہ مختلف قسموں کے شیشوں سے بنا ہوا ہے اور اس کا شمار دنیا کی خوبصورت ترین عمارات میں ہوتا ہے پیرس کا لارے میوزیم (دنیا کا سب سے مشہور آرٹ میوزیم ہے اور اس کے علاوہ پیرس کے سینٹر میں آرک آف ٹرمف (ARCH OF TRUIMPH) فرانسیسیوں کے شاہکار کا بہترین نمونہ ہے یہ نپولین کے حکم سے تعمیر کروایا گیا تھا۔ اِس کے ساتھ ایک کشادہ شاہراہ ہے جو کہ چمس ایلے سیس کے نام سے منسوب ہے۔ یہاں ہر وقت گاڑیوں کی چہل پہل رہتی ہے۔

ایفل ٹاور کا شمار پیرس کے دلچسپ ترین مقامات میں ہوتا ہے یہ شہر پیرس کا نشان بھی ہے اس کی اونچائی دس ہزار اور پچاس فیٹ ہے یہی

وجہ ہے کہ اسے پیرس کے آخری کونے سے بھی دیکھا جاسکتا ہے ایفل ٹاور کے آگے رنگا رنگ فوارے لگے ہوئے ہیں جو اس کی دلکشی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اور اس کے پیچھے ایک خوبصورت باغ بھی ہے۔

فرانس کا سب سے بڑا شاہی گھر اور انسٹی ٹیوٹ آف فرانس بھی پیرس میں واقع ہے۔ پیرس میں ایک پُل کے قریب مجسمہ آزادی ہے اب آپ کو حیرانگی ہوگی کہ وہ تو نیویارک میں ہے لیکن درحقیقت اس کو بنانے والا ایک فرانسیسی آدمی تھا جس کا نام BARTHOLDI تھا۔ بالکل ویسا ہی مجسمہ پیرس کے مرکز میں ہے۔

پیرس میں ایک جدید ریلوے سٹیشن اور ایک مشہور ائیر پورٹ ہے جس کا نام AIRPORTOF LIBERTY ہے۔

دراصل پیرس خاصا بڑا شہر ہے اس کی آبادی بھی بہت زیادہ ہے۔ ہمیشہ بڑے شہروں میں مسائل بھی زیادہ ہوتے ہیں بالکل اسی طرح پیرس میں زیادہ آبادی ہونے کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ ٹریفک کا ہے یعنی وہاں ٹریفک عموماً جام رہتی ہے جس کی وجہ سے سفر کرنا ایک حد تک دشوار ہوتا ہے اور وقت بھی بہت خرچ ہوتا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے پیرس میں بہت پہلے "انڈر گراؤنڈ ریل وے" کا نظام شروع ہوا۔ یہ ٹرینیں زمین کے نیچے ہی نیچے شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلتی ہیں ان ٹرینوں کی وجہ سے وقت کم لگتا ہے اور سفر بھی آرام دہ ہوتا ہے ایسی ٹرینوں کا نام METRO ہے۔

پیرس میں جس جگہ بھی نظر دوڑائیں سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس شہر کا موسم بھی خوشگوار رہتا ہے۔

ہر سال سیاحوں کی خاصی تعداد سیر و سیاحت کی غرض سے یہاں آتی ہے جس کی بناء پر یہاں ہر وقت رونق لگی رہتی ہے۔

الغرض یہ ایک ایسا شہر ہے بے مثال ہے کہ جس پر فرانسیسی جتنا بھی اترائیں کم ہے۔

میری کتاب

مرا دل لبھاتی ہے میری کتاب
بہت مجھ کو بھاتی ہے میری کتاب
پُرانے زمانے کے قصّے مجھے!
مزے سے سُناتی ہے میری کتاب
کراتی ہے اونچے مقاموں کی سیر
ہَوا میں اُڑاتی ہے میری کتاب
پہاڑوں کے، جھیلوں کے، دریاؤں کے
نظارے دکھاتی ہے میری کتاب
مجھے صاف رہنے کے اچھے اصول!
سکھاتی، پڑھاتی ہے میری کتاب

مرسلہ:۔ محمد اکرم سیالوی، ننکانہ صاحب

آؤ ملائیں ہاتھ

زیڈ بابر۔ عمر ۱۷/ سال دہم، قلمی دوستی، مستقبل کے بارے میں... نہیں سوچا۔

بیت الصف ۱/۷ مسجد روڈ۔ بہار کالونی۔ کراچی

جاوید اقبال سہتہ، ۱۵/ سال جماعت دہم ٹیبل ٹینس کھیلنا، مضمون، انگریزی ڈاکٹر بننے کا شوق ہے۔

پوسٹ آفس رانی پور۔ ضلع خیرپور۔

بشیر احمد غوری، ۱۶/ سال جماعت نہم، آنکھ مچولی پڑھنا، مضمون، سائنس قوم کی خدمت کے لیے ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں۔

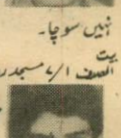

شاہی بازار۔ اوباڑو۔ ضلع سکھر

ناصر علی کشمیری۔ ۱۶/ سال جماعت دہم، رسائل پڑھنا مضمون، اُردو، فوجی بن کر ملک کی حفاظت کریں گے۔

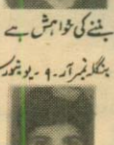

۶۰۸/ الیس۔ کورنگی روڈ۔ نمبر ۱۔ کراچی

تمیز الدین۔ عمر، ۱۶/ سال جماعت دہم، سیر و تفریح مضمون، حساب، پائلٹ بننے کی خواہش ہے۔

بنگلہ نمبر آر۔ ۹۔ یونیورسٹی کیمپس۔ پشاور

جہانزیب سہیل، ۱۴/ سال فرسٹ ایئر، ٹکٹ جمع کرنا مضمون، ریاضی، فزکس، کمپیوٹر انجینئر بننا چاہتے ہیں۔

ڈاکخانہ ڈھکی۔ تحصیل و ضلع چارسدہ

محمد جمیل، ۱۵/ سال جماعت ہشتم مطالعہ کرنا مستقبل کے بارے میں نہیں سوچا۔

مکان نمبر ۹۔ بلاک بی۔ شہباز کالونی۔ ٹنڈو الہ یار۔ ضلع حیدرآباد

عابد جان۔ ۱۴/ سال جماعت نہم، آنکھ مچولی پڑھنا۔ انگریزی، قوم کی خدمت کے لیے پائلٹ بننا چاہتے ہیں۔

گاؤں بدرشی علیے خیل۔ تحصیل نوشہرہ۔ ضلع پشاور

جمال حیدر، ۱۶/ سال نہم کیمبرج، اخبار و رسائل پڑھنا، حیاتیات، ایئرفورس کے پائلٹ بن کر ملک کی خدمت کرنے کا ارادہ ہے

تحصیل ہنگو۔ ضلع کوہاٹ

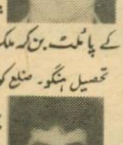

بخت اسلام خان۔ ۱۷/ سال دہم، آنکھ مچولی پڑھنا، مضمون، انگریزی، فزکس میکینیکل انجینئر بننے کا شوق ہے۔

ڈی ۹۸ گلی نمبر ۴۰ بلاک بی۔ اردو بازار۔ شیرشاہ کراچی

عبدالرزاق عابد۔ ۱۷/ سال جماعت دہم، قلمی دوستی کرنا، مضمون، فزکس، فوجی بن کر ملک کی پاسبانی کریں گے۔

آزاد ملک ہاؤس۔ کوٹ غلام محمد۔ تھرپارکر

علی ناز اعوان، ۱۹/ سال جماعت دہم، مطالعہ، تفریح، اسلامیات، عربی، فوجی بن کر کشمیر کے لیے لڑنا چاہتے ہیں۔

گاؤں کنڈیاں۔ جبہ بازار۔ تحصیل و ضلع مظفرآباد۔ آزاد کشمیر

سید عدنان معین، ۱۸ سال
انٹر، ٹکٹ جمع کرنا ۔
حساب، فزکس، پائلٹ
بن کر قوم کی خدمت کریں گے ۔

معرفت محمد احتشام الدین کاظمی ایڈیشنل ڈسٹرکٹ سیشن جج ۔ کنڈیارو

ثاقب ایراء، عمر ۱۴ سال
جماعت نہم، سکے جمع کرنا
مطالعہ پاکستان، فوج میں
شامل ہو کر ملک کی خدمت کریں گے ۔

سی ۱/۴۹ ۔ بلاک ایچ نارتھ ناظم آباد ۔ کراچی

محمد پرویز نور، ۱۵ سال
دہم، قلمی دوستی، سکے و ٹکٹ
جمع کرنا، مضمون، حیاتیات
ڈاکٹر بن کر قوم کی خدمت کریں گے ۔

عالمگیر پارک ۔ نیو غازی روڈ ملتان روڈ ۔ لاہور

عابد حسین، عمر ۱۷ سال
فرسٹ ایئر، قلمی دوستی
مضمون، اردو، بزنس مین
بن کر امیر ہونا چاہتے ہیں ۔

پوسٹ بکس نمبر ۱۸ ۔ ڈیرہ غازی خان

عرفان قیصر، عمر ۱۲ سال
ششم، کرکٹ کھیلنا
حساب، پائلٹ بن کر
ملک کی خدمت کریں گے ۔

فیض آباد نمبر ۲ ۔ زریاب کالونی ۔ ملتان والا ۔ پشاور

آصف رحمٰن، ۱۴ سال
جماعت ہشتم، تقریر کرنا ۔
انگریزی، میجر عزیز بھٹی
شہید سے متاثر ہو کر فوج میں جانا چاہتے ہیں ۔

بی ۔ ۸ گلستان کالونی ۔ ساہیوال

نجف سرور، عمر ۱۶ سال
جماعت دہم، مطالعہ اور
قلمی دوستی، حیاتیات، ملک
کی ترقی کے لیے سائنسدان بننا چاہتے ہیں ۔

مکان نمبر ۱ برنی اسٹریٹ نمبر ۲۹ ۔ گڑھی شاہو ۔ لاہور

جاوید اقبال ملک، ۱۶ سال
دہم، فٹ بال کھیلنا،
مضمون، اسلامیات، استاد
بن کر انسانیت کی خدمت کریں گے ۔

معرفت فرخ جیولرز ۔ صرافہ بازار ۔ گوجر خان ۔ راولپنڈی ۔

فخرالدین باجوہ ۔ ۱۱ سال
ہفتم، کرکٹ کھیلنا ۔
انگریزی، عربی، پائلٹ
بننے کا شوق ہے ۔

مکان نمبر ۱۹ ۔ نیو صادق بازار ۔ رحیم یار خان

ثاقب اکرم آرائیں ۔ ۱۲ سال
ہفتم، کرکٹ کھیلنا ۔
مضمون، اردو، وطن کی خدمت
کی خاطر فوجی بنیں گے ۔

پٹھان کالونی ۔ حیدرآباد ۔

غلام محمد ابراہیم ۔ ۱۳ سال
نہم، کرکٹ کھیلنا، تقریر کرنا
مضمون، حیاتیات، سائنسدان
بن کر ملک کی خدمت کرنے کا ارادہ ہے ۔

۳/۱۹۲۳ فیڈرل بی ایریا ۔ کراچی ۔

جاوید اقبال اُپل، ۱۵ سال
دہم، سکے اور اسٹکرز جمع کرنا
حساب، حیاتیات، پولیس
افسر بن کر قوم کی خدمت کریں گے ۔

۱۰/۲۵۰ ایف واہ کینٹ ۔

محمد ثاقب، عمر ۱۴ سال
جماعت نہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، کیمیا، کیپٹن
بننے کا شوق ہے ۔

معرفت محمد یوسف ٹاؤن کمیٹی ۔ پیر محل ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

مصلح الدین محمد، ۸ سال
جماعت سوم، کہانیاں پڑھنا
مضمون، حساب، جنگی جہاز کا
پائلٹ بن کر دشمنوں کے چھکے چھڑانے کا عزم ہے ۔

بنگلہ نمبر آر ۔ ۹ ۔ یونیورسٹی کیمپس ۔ پشاور

اسد ابڑو ۔ عمر ۱۶ سال
دہم، کرکٹ کھیلنا،
مضمون، سندھی،
لیڈر بننے کا شوق ہے ۔

اے ۔ ۲۷ ۔ غلام شاہ کلہوڑا کالونی ۔ حیدرآباد

مشتاق ندیم اختر، ۱۵ سال
جماعت نہم، بچوں کے رسائل
پڑھنا، عربی، انجینئر بن کر
ملک کے کام آئیں گے ۔

فیڈرل گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول ۔ نمبر ۲ ۔ چکلالہ ۔ راولپنڈی

حامد اقبال، عمر ۱۳ سال
ششم، اچھی کتب کا مطالعہ
مضمون، اردو، فوج میں شمولیت
کا ارادہ ہے تاکہ جام شہادت نوش کر سکیں ۔

پاک جنرل اسٹور ریل بازار تاندلیانوالہ، تحصیل سمندری، فیصل آباد

محمد یونس، ۱۵ سال
فرسٹ ایئر، قلمی دوستی
مضمون، اردو ۔
ڈاکٹر بننے کا شوق ہے ۔

عبدالکریم بک ڈپو ۔ ڈہرکی ۔ ضلع سکھر

محمد مبین ۔ ۱۲ سال
ہشتم، کرکٹ، آنکھ مچولی پڑھنا
مضمون، سائنس، ڈاکٹر
بن کر ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔
۳/۳۴ بی ون ایریا۔ لیاقت آباد۔ کراچی نمبر ۱۹

عمر اختر، ۱۰ سال
جماعت، پنجم، ٹکٹ جمع کرنا
مضمون، حساب، پائلٹ
بننے کا شوق ہے۔
ایف۔ ۸/۸ نذیر اپارٹمنٹ۔ کشمیر روڈ۔ راولپنڈی۔

محمد انوار انصاری، ۱۸ سال
دہم، قلمی دوستی، سیر و تفریح
مضمون، ریاضی، اسلام کے
محافظ بن کر صحابہ کرامؓ کے دشمنوں سے ٹکرانا۔
۴۶۰۔ ۲۰ سی۔ لانڈھی کالونی۔ کراچی

شیخ الیاس احمد، ۱۶ سال
فرسٹ ایئر، بیڈمنٹن کھیلنا
مضمون، حیاتیات، ڈاکٹر
بن کر بیماریوں کا سدباب کر کے قوم کی خدمت کریں گے۔
۱/۵ ۔ ۱۴۹۸ ۔ خواجہ کالونی ۔ ملتان

سلمان اختر ۱۲ سال
جماعت ہشتم، ٹکٹ جمع کرنا
بجلی کے آلات بنانا، سائنس
ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کرنا چاہتے ہیں۔
۴۷ ڈی، رضوان بلاک۔ اعوان ٹاؤن۔ لاہور ۱۸۔

محمد فہیم، عمر ۱۲ سال
جماعت ہفتم، مضمون
سائنس، انجینئر
بننا چاہتے ہیں۔
معرفت رحیم بان ہاؤس۔ فیوچر کالونی۔ لانڈھی۔ کراچی۔

طارق عزیز، ۱۵ سال
دہم، آنکھ مچولی پڑھنا
مضمون، انگریزی
وکیل بننے کا ارادہ ہے۔
دکان نمبر ۲۸۲۲۔ تھانہ سی ڈویژن۔ پشاور

منظور احمد، عمر ۱۴ سال
ہشتم، کرکٹ، مطالعہ کرنا
سائنس، سائنسدان بننے کا
ارادہ ہے، کیونکہ ملک کو سائنسدانوں کی ضرورت ہے
سی ۱۴/۲۰۵ بشیر شاہ کالونی۔ کراچی ۲۸

خالد ریاض ساہی ۱۶ سال
انٹر۔ قلمی دوستی، جوڈو کراٹے
مطالعہ پاکستان، فوجی افسر
بن کر قوم کی خدمت کا عزم ہے۔
نزد مسجد غوثیہ رضویہ۔ محلہ بہاولپورہ تحصیل حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ

راجہ امیر مختار، ۱۷ سال
فرسٹ ایئر، قلمی دوستی
مضمون انگریزی، ایس پی
بن کر دکھی انسانیت کا ارادہ ہے۔
معرفت عمران واچ میکر، ریلوے روڈ۔ پنڈدادنخان۔ جہلم

عدنان تاج، ۱۳ سال
نہم، کرکٹ کھیلنا۔
مضمون، انگریزی۔
ڈاکٹر بن کر غریبوں کی خدمت۔
بی ۳۸۳ ۔ لطیف آباد نمبر ۱۰ ۔ حیدرآباد

محمد اجود، عمر ۱۴ سال
ہفتم، کرکٹ کھیلنا،
مضمون، سائنس، ڈاکٹر
بن کر قوم کی خدمت کریں گے۔
اسعد نیوز ایجنٹ۔ تحصیل علی پور۔ ضلع مظفر گڑھ۔

- قلمی دوستی کے اِس کالم میں صرف اسکول کے طلب شریک ہو سکتے ہیں۔
- کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا۔
- خراب اور نامکمل کوپن قابل قبول نہ ہوں گے۔

نام ———— عمر ———— جماعت ————
مشاغل ———— اسکول میں پسندیدہ مضمون ————
بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں۔ ———— وجہ ————
پتہ ————————————

شانی ایوب

امّی ابّو کا صفحہ

آنکھ مچولی کو اکثر و بیشتر اپنے قارئین بچوں کے ایسے خطوط ملتے رہتے ہیں جنہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اُن بچوں کے والدین اُنہیں عام کہانیوں کی کتابیں یا بچوں کے رسالے وغیرہ پڑھنے سے سختی کے ساتھ منع کرتے ہیں۔ ان خطوط میں بعض بچے ہم سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم اُن کے والدین کو براہِ راست خط لکھ کر کہانیوں کی کتابوں اور رسالوں کی افادیت سے آگاہ کریں ایسے خطوط سے بآسانی اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر والدین غیر نصابی کتابیں پڑھنے کو فضول کام اور وقت کا زیاں تصوّر کرتے ہیں۔ آخر کیوں؟

عام مشاہدہ ہے کہ اکثر پڑھے لکھے والدین اپنے بچوں کی نصابی تعلیم پر بے حد توجہ دیتے ہیں۔ اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کے جگر گوشے ہر کلاس میں نمایاں کامیابی حاصل کریں۔ نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچے اپنے نصاب پر زیادہ وقت اور ذہنی توانائی صرف کریں۔ یہ ایک فطری اور صحت مند رویّہ ہے، لیکن اس رویّہ کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہمیں اصرار ہے کہ غیر نصابی کُتب پڑھنے سے بچوں کو روکنا اُن کی شخصیت کے ساتھ شدید زیادتی ہے۔ کیسے؟ آیئے دیکھتے ہیں۔

دنیا بھر میں ہر درجہ کے تعلیمی نصابوں کے جو مقاصد تصوّر کیے جاتے ہیں اُن میں طلبہ کو مخصوص مضامین کی ضروری معلومات فراہم کرنا، اُنہیں تہذیب و شائستگی اور ادب و احترام کی اقدار سے متعارف کرانا اور سب سے بڑھ کر طلبہ کے جذبۂ تجسس اور تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرنا شامل ہے۔ تاکہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں تیزی کے ساتھ ہر آن بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اُن سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکیں نیز ایجادات و اختراعات کی طرف مائل ہو کر نئی دُنیا کی تخلیق و تعمیر میں اپنا کردار ادا کر سکیں، لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہوگا کہ تعلیمی نصاب خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو وہ بچوں کی وسیع ذہنی ضروریات اور تقاضوں کی تکمیل نہیں کرتا۔ ماہرینِ تعلیم کا یہی خیال ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر بچوں کی ذہنی ضروریات کی تکمیل کے لیے کس ذریعے سے رجوع کیا جائے۔ ہمارا جواب غیر نصابی کتب سے استفادہ ہے۔

ادبی کہانیاں (جن میں پریوں وغیرہ کی کہانیاں بھی شامل ہیں) فکشن اور نظمیں وغیرہ بچوں کے جذبۂ تجسس ان کی قوتِ متخیلہ اور تخلیقی صلاحیت کو بیدار کرتی ہیں اُنھیں زندگی کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اُن میں محبت، بے غرضی، ایثار، عفو و درگزر، انسان دوستی اور تہذیب و شائستگی کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔ اُنہیں مصائب و مشکلات میں ثابت قدم رہنا سکھاتی ہیں۔ اُنہیں ضروری سنجیدگی، متانت اور دیانت کے احساس سے روشناس کراتی ہیں۔ یہ ہمارا نہیں دُنیا کے عظیم فلسفیوں اور ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے۔ آپ اپنے بچوں کی نصابی تعلیم پر بے شک بھرپور توجہ دیجیے لیکن انہیں صحت مند غیر نصابی کتب پڑھنے سے نہ روکیے۔ بلکہ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ خود اپنے بچوں کو اچھی اچھی کہانیوں کی کتابیں اور رسالے لا کر دیں۔ اگر آپ کا بچہ نصابی تعلیم پر ہر روز دس گھنٹے صرف کرتا ہے تو اُسے کم از کم دو گھنٹے غیر نصابی کتب بھی پڑھنے دیں۔ اس سے کم از کم اس کے اندر عادتِ مطالعہ پیدا ہوگی۔ دیگر فوائد الگ ہیں۔ بچوں سے والدین کا متوازن رویّہ ہی ان کی شخصیت میں توازن پیدا کرتا ہے اور اچھے والدین اس راز سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں !
TAPAL
TAPAL TEA
DANEDAR
Leaf Blend
Net weight when packed
200 grams
ٹپال چائے
دانے دار
لیف بلینڈ
فوری تیار، زیادہ خوشبودار، گہری رنگت، یادگار لذت، ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین
MASS

REGD. No. M-266 NOVEMBER 1988

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI